Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1961ء

اسلام کا معاشی نظام

خدا کا حکم

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹) ۔
تجھ سے پوچھتے ہیں کہ (دوسروں کی ضروریات کے لئے) کسقدر دیدیا جائے۔
ان سے کہدو کہ جسقدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے، سب۔

رسول اللہؐ کی عملی تشریح

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ جس کے پاس سواری کے لئے زائد اونٹ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس سواری نہیں ۔ جس کے پاس زائد زاد راہ ہو وہ اسے دیدے جس کے پاس زاد راہ نہیں ۔ حضرت ابوسعیدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ اسی طرح مختلف اموال کا ذکر فرماتے چلے گئے حتکہ ہم نے محسوس کر لیا کہ ضرورت سے زائد مال رکھنے کا ہم میں سے کسی کو حق نہیں ۔ (مشکواۃ کتاب الجہاد)

اسلامی مملکت میں یہ انتظام انفرادی نہیں، اجتماعی ہوگا

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گل برگ لاہور

قیمت ۷۵ پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
ہندو پاکستان سے سالانہ:- آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ:- ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندو پاکستان سے:- ۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر:- ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ:-
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۴	جولائی ۱۹۶۱ء	نمبر ۷

فہرست مضامین

لمعات ——— ۲
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟ ——— ۹
ایک اور طاہرہ بیٹی کا خط ——— ۴۵
باب المراسلات ——— ۴۹
صدرِ پاکستان کا پیغام عید ——— ۵۷
مفتی محمد شفیع صاحب اور صدرِ پاکستان کے درمیان خط و کتابت ——— ۶۱
معارف الحدیث ——— (محترم مولانا مودودی صاحب) ——— ۶۷
حقائق و عبر ——— ۷۳
طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ——— ۷۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

۲۰ جون کی شام کو، لاہور میں طلبا کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے، جسٹس شیخ محمد شریف صاحب نے اپنی تقریر میں بعض باتیں ایسی کہیں جو قوم کی گہری توجہ کی محتاج ہیں۔ انھوں نے پہلے 'تحریکِ پاکستان' کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ابتداءً مسلمان، غیر منقسم ہندوستان میں اپنے تحفظات پر زور دیتے رہے، لیکن اس سے قوم کے اندر کوئی خاص حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے بعد جب ان کے سامنے ایک جداگانہ مملکت کا تصور آیا تو یہ چیز ان کی رگِ جان میں برقِ تپاں بن کر دوڑ گئی۔ اور وہ ہر مخالفت کا مقابلہ کرنے کے لئے چٹان کی طرح کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ قوم اس مطالبہ کو لے کر متحدہ طور پر کھڑی ہو گئی۔

> لیکن یہ امر موجب حیرت تھا کہ بعض مذہبی علماء نے مطالبۂ پاکستان کو خلافِ اسلام قرار دیدیا۔ ان کے نزدیک، غیر مسلموں کا مسلمانوں پر غلبہ و اقتدار اسلام کے نظریہ اور روح کے عین مطابق تھا۔

اس پس منظر میں انھوں نے قوم کو متنبہ کیا کہ

> علماء کا یہ طبقہ، جو مطالبۂ پاکستان کو خلافِ اسلام قرار دیتا تھا، اب بھی موجود ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ عوام کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی غیر اسلامی سرگرمیوں کو مذہب کے نقاب میں پھر سے شروع کر دے
>
> (پاکستان ٹائمز ۲۱ جون)

یہ ہے وہ خطرہ جس سے جسٹس موصوف نے قوم کو متنبہ کیا ہے۔ جسٹس شریف صاحب، سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج ہیں اس کے بعد یہ اسلامی قوانین کے کمیشن کے صدر مقرر ہوئے تھے اور آئینی کمیشن کے رکن۔ ایسی ذمہ دار شخصیت کی طرف سے اس قسم کا انتباہ یقیناً درخورِ اعتنا ہے۔

آپ طلوعِ اسلام کے دورِ اوّل کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ اس میں آپ کو تحریکِ پاکستان کی تاریخ ملے گی۔ آپ

دیکھیں گے کہ اُس زمانہ میں قوم کو مطالبہ پاکستان کے سلسلہ میں، انگریز اور ہندو سے اس شدت کی لڑائی نہیں لڑنی پڑی تھی، جس شدت کی لڑائی، ان "علماء" سے لڑنی پڑی تھی جو اس مطالبہ کو اسلام کے خلاف قرار دیتے تھے۔ قوم کی بیشتر توانائیاں، انہی کے خلاف محاذ قائم کرنے میں صرف ہو گئی تھیں اور آخر الامر حصولِ پاکستان میں جو نقصانات اٹھانے پڑے وہ بھی انہی حضرات کی مساعی کا صدقہ تھا۔ ان میں کچھ لوگ تو ان علاقوں میں بستے تھے جو بعد میں پاکستان کا حصہ بن گئے۔ لیکن باقی ان مقامات کے رہنے والے تھے جو ہندوستان میں شامل رہے۔ سب سے بڑی تعجب انگیز بات یہ تھی کہ یہ لوگ وہاں سے اُٹھ کر پاکستان آ گئے اور یہاں جم کر بیٹھ گئے۔ حالانکہ یہ امر بالکل واضح تھا کہ جس پاکستان کے مطالبہ کو یہ خلافِ اسلام قرار دیتے تھے، اس کی طرف منتقل ہو کر آ جانا (ان کے) اسلام کی رُو سے کس طرح جائز قرار پا سکتا تھا!

جو لوگ پاکستان کو اپنے عقیدہ کی رُو سے خلاف اسلام سمجھتے تھے، ان کی پاکستان میں موجودگی یقیناً خطرہ سے خالی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ طلوعِ اسلام شروع سے قوم کو اس خطرہ سے آگاہ کرتا چلا آ رہا ہے۔ آپ پاکستان کی تیرہ سالہ تاریخ کو سامنے لائیے اور دیکھئے کہ اس ملک میں مذہب کے نام پر جس قدر خلفشار پیدا کیا گیا ہے، اس میں ان لوگوں کا کس قدر ہاتھ تھا جو نظریۂ پاکستان کے مخالف تھے۔ اس وقت ان حضرات کی عملی سرگرمیوں میں زیادہ جوش نہیں لیکن پاکستان کے خلاف جو جراثیم ان کے سینوں میں پرورش پاتے چلے آ رہے ہیں، ان میں تو کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہو گئی۔ اس اعتبار سے جسٹس شریف صاحب کا انتباہ قابلِ فہم اور قوم کے گہرے غور و فکر کا مستحق ہے۔

مخالفت کی نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں، لیکن جو مخالفت مذہب کی آڑ میں کی جائے وہ بڑی شدید ہوتی ہے اور اس کے نتائج بے حد مضرت رساں اور تباہ کن۔ ذرا غور کیجئے کہ آپ ایک بات کہتے ہیں۔ فریقِ مخالف اس پر اعتراض کرتا ہے۔ آپ اس اعتراض کا جواب دیتے ہیں وہ اپنی تائید میں دلائل و براہین پیش کرتا ہے۔ آپ اپنے دعوے کے حق میں دلائل دیتے ہیں۔ سننے والے ان دلائل کو سنتے ہیں، ان پر غور کرتے ہیں اور پھر کسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اس کے بعد بھی آپ کے پاس اس امر کی گنجائش ہوتی ہے کہ آپ مزید دلائل سے ان کی رائے کو اپنے حق میں کر لیں۔

اس کے برعکس آپ ایک بات کہتے ہیں اور فریقِ مخالف جھٹ سے کہہ دیتا ہے کہ یہ "خدا اور رسولؐ" کے حکم کے خلاف ہے۔ اس کے بعد وہ اسلام کے نام پر دُہائی دینا شروع کر دیتا ہے، عوام کے جذبات کو بھڑکاتا ہے۔ ملک میں ایک شور برپا کر دیا جاتا ہے۔ چاروں طرف ہنگامے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ اس غوغا آرائی میں نہ کوئی دلیل سنتا ہے نہ برہان۔ نہ کوئی عقل سے کام لیتا ہے نہ فکر سے۔ نہ کوئی بات کی معقولیت پر غور کرتا ہے نہ اس کے مصالح و نتائج پر۔ حتیٰ کہ کوئی اتنا سوچنے کیلئے بھی تیار نہیں ہوتا کہ یہ جو کہا جا رہا ہے کہ یہ "خدا اور رسولؐ" کے حکم کے خلاف ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے؟

آپ سوچئے کہ جس ملک کی قریب اسّی فیصد آبادی ان پڑھ ہو، وہاں دوسروں کی مخالفت اور اپنی بات منوانے کے لئے یہ طریق اختیار کیا جائے، تو اس ملک کا کیا بنے گا؟ بالخصوص جب "خدا اور رسولؐ" کا نام لینے والوں میں وہ گروہ موجود ہو جو شروع سے

نظریۂ پاکستان کا مخالف تھا!

ہمیں تسلیم ہے کہ پاکستان سیکولر نظام کا حامی نہیں، جس میں ہر بات کا فیصلہ شخصی آراء (یا تنہا عقل و فکر) کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ پاکستان حاصل ہی اسی لئے کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے، اور اسلامی نظام، اسلام کی حدود کے اندر ہی قائم ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات خلافِ اسلام نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ متعین کرنے کے لئے کہ فلاں بات اسلام کے خلاف ہے یا نہیں، کوئی معیار اور اصول اور قاعدہ اور قانون ہونا چاہیئے۔ نہ یہ کہ جس بات کو کسی نے خلافِ اسلام کہہ دیا، وہ خلافِ اسلام ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ جس بات کو "علماء خلافِ اسلام کہہ دیں، اُسے خلافِ اسلام سمجھا جائے گا۔ ہمارے دل میں ان حضرات کا احترام ہے جو دین کے صحیح علم اور دیانت سے بہرہ یاب ہیں، لیکن کسی فرد یا جماعت کو یہ حق دیدینا، یا اس کا یہ دعویٰ کرنا کس طرح جائز قرار پا سکتا ہے کہ

(۱)۔ جس بات کے متعلق وہ کہدیں کہ وہ اسلام کے خلاف ہے اُسے بلا چون و چرا اسلام کے خلاف تسلیم کر لیا جائے۔

(۲)۔ اگر کوئی اس سے متفق نہ ہو تو اس کے خلاف لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر دیا جائے۔ ہنگامے برپا کر دیئے جائیں، اور جب تک ان کی بات نہ مان لی جائے، ہنگامہ آرائی کی اس مہم کو جاری رکھا جائے، خواہ اس میں کتنا ہی خون خرابہ کیوں نہ ہو۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں اس قسم کی ہنگامہ آرائی کو جو مذہب کے نام پر برپا کی جائے، "جہاد" قرار دیدیا جاتا ہے۔ اور اس میں شریک ہونے کو بلند ترین نیکی اور ثواب کا کام، اس لئے ایسے ہنگامے بڑی آسانی سے پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ اس قسم کے ہنگاموں سے ہم کس قدر تباہ ہو چکے ہیں، ہماری سابقہ تاریخ اس پر شاہد ہے۔

"فلاں بات اسلام کے خلاف ہے یا نہیں؟" اسکا فیصلہ کرنے کے لئے صحیح طریقہ تو وہی ہے جسے قرآن کریم نے تجویز کیا ہے یعنی امت کا اجتماعی نظام ہو جو خدا کی کتاب کو صحیح اور غلط اور حق و باطل کا معیار قرار دے۔ اور جو فیصلہ وہاں سے صادر ہو وہ ہر ایک کے لئے قابلِ قبول ہو۔ یہی طریقِ کار صحیح اسلامی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کے زمانہ میں رائج تھا۔ اُس زمانہ میں کہیں یہ نظر نہیں آتا کہ افراد (خواہ وہ کتنے ہی بڑے عالم کیوں نہ ہوں) اپنے اپنے طور پر فتوے دیا کرتے تھے کہ فلاں بات اسلام کے مطابق ہے یا اس کے خلاف۔ اس قسم کے اجتماعی نظام کا قیام اُمت کا اوّلین فریضہ ہے۔ لیکن جب تک ایسا نظام قائم نہ ہو، صحیح طریقِ کار یہ ہوگا کہ جو معاملہ سامنے آئے، اس کے متعلق (جس کا جی چاہے) اس امر کا اظہار کر دے کہ اس کے علم و بصیرت کی رُو سے پوزیشن یہ ہے۔ ایسا کرنے میں وہ دلائل اور اسناد بھی پیش کرے۔ لیکن کسی کو اس پر اصرار نہیں کرنا چاہیئے کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں وہی حق ہے۔ اور اگر اسے نہ مانا گیا تو ہم اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دینگے۔ نہ ہی اس قسم کی ذہنیت مستحسن قرار پا سکتی ہے کہ دین کی حفاظت کا درد صرف ہمارے سینے میں ہے۔ جو لوگ ہمارے گروہ سے باہر ہیں، وہ ملحد و بے دین، اور اسلام کی جڑیں کاٹنے کے درپے ہیں۔ یہ ذہنیت نفرت کی پیدا کردہ اور انتقام کی پروردہ

ہوتی ہے۔ دین کی حفاظت کا جذبہ کسی خاص گروہ کی اجارہ داری نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی دین کا علم کسی خاص حلقہ میں محدود ہو کر رہ سکتا ہے۔

اب آیئے اس خطرہ کی طرف جس کی طرف جسٹس شریف صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ پاکستان اس وقت بڑے نازک دور میں سے گزر رہا ہے۔ آپ سوچئے کہ اگر اس گروہ نے جو نظریہ پاکستان کو اسلام کے خلاف قرار دیتا تھا، مذہب کی آڑ میں اپنی تخریبی سرگرمیاں شروع کر دیں، اور اس طرح درونِ ملک خلفشار پیدا کر دیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس سلسلہ میں ہم ملتِ پاکستانیہ سے اتنا عرض کرنا کافی سمجھتے ہیں کہ وہ ذرا ہندوستان کے مسلمانوں پر ایک نظر ڈالیں اور سوچ لیں کہ اگر پاکستان نہ بنتا تو آج ہماری حالت کیا ہوتی۔ وہاں کے مسلمانوں نے مسلسل تیرہ برس کی تباہی و بربادی کے بعد تنگ آکر پچھلے دنوں دہلی میں "مسلم کنونشن" کا انعقاد کیا، تاکہ اُس ملک میں مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق کچھ سوچا جائے۔ اس کنونشن کے سربراہ، کوئی انتہا پسند فرقہ پرست نہیں تھے۔ وہاں کے چوٹی کے قومیت پرست تھے ——— ڈاکٹر سید محمود، کنونشن کے صدر، اور مولانا حفظ الرحمٰن، استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے۔ (بعض حلقوں میں یہ خبر بھی گرم تھی کہ کنونشن خود حکومت کے ایما پر بلائی گئی ہے) بہرحال، اس قسم کے قومیت پرست طبقہ نے کنونشن میں جو کچھ کہا، وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالتِ زار کا ہلکا سا نقشہ سامنے لے آتا ہے۔ ڈاکٹر محمود نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا۔

"یہ صحیح ہے کہ گذشتہ تیرہ سال میں فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہا ہے، اور آئندہ بھی بظاہر اسکے ختم ہونے کے امکان نظر نہیں آتے۔ جبلپور کا سانحہ اس سلسلہ کی آخری کڑی نہیں معلوم ہوتی۔ آج مسلمان اس ملک کا شہری ہوتے ہوئے بھی اپنی جان و مال، عزت و آبرو کو محفوظ نہیں پا رہا ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے جمع ہونا وقت کا ایک اہم ترین تقاضا ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے کہا کہ۔

"آزادی کے بعد کے حالات نے ہم پر مایوسی طاری کر دی ہے۔ آزادی کے بعد ملک میں جو نیا اقتصادی ڈھانچہ وجود میں آیا اُس نے مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے بالکل ختم کر دیا۔"

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنے خطبہ میں کہا۔

"ایک طرف ہماری شہری زندگی میں حوادث کا تسلسل، اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں، تعلیمی اداروں، نصاب کی کتابوں، صنعت و حرفت کے مرکزوں، تجارت اور کاروباری میدانوں تک میں مسلم اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک، حق تلفی، ناانصافی، ملک کے مختلف حصّوں میں مسلم اوقاف اور مساجد کی بربادی اور ویرانی، نیز مجالسِ قانون ساز میں ناکامیٔ نمائندگی کی شکایتوں نے جو افسوسناک شکل اختیار کر لی ہے اور پچھلے تیرہ سال کی سرگذشت نے اس کا جو ریکارڈ بنا دیا ہے اس سے سب بخوبی واقف ہیں۔ آج اس کی تفصیلات کو دہرانا سراسر غیر ضروری ہے۔"

مسلمان تو ایک طرف، غیر مسلموں تک نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کیا ہو چکی ہے۔ مثلاً دلی کانگریس کمیٹی کے صدر، برجموہن نے زور دیکر کہا کہ

"جن کی ساری زندگی سامراج کے خلاف لڑتے گذری، جنھوں نے آزادی کے لئے جیلیں کاٹیں۔ آج جب وہ کہتے ہیں کہ مسلمان مایوس ہیں تو سوچنا پڑتا ہے، دلوں کو ٹٹولنا پڑتا ہے۔ ان لوگوں نے فرقہ پرستی کا اس وقت مقابلہ کیا جب اس کی قیمت جان دیدینا تھا۔ اس لئے یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ ایسی کیا بات ہوئی جو یہ کنونشن بلایا گیا۔"

اسی طرح مسز سبھدرا جوشی نے، اپنی تقریر میں جبلپور کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"وہ برطانوی حکومت کا مقابلہ کرتے ہوئے بار بار جیل گئے۔ عمر کا اچھا خاصہ حصہ جیل میں گذارا۔ لیکن اب وہ لاچار اور بے بس ہیں۔ یہ باتیں دیکھ کر ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے، لیکن جس کا گھر دس سال میں تین بار جلایا گیا ہو، اُس سے کس منھ سے یہ مطالبہ کر سکتے ہیں؟"

کنونشن میں جو قراردادیں پاس ہوئیں، ان میں سے دو ایک ملاحظہ ہوں۔ ایک قرارداد میں کہا گیا۔

"انڈین مسلم کنونشن کا یہ اجلاس، ان فسادات پر سخت تشویش کا اظہار کرتا ہے جو فرقہ واریت کے نام پر ملک کی آزادی کے بعد سے مسلسل مختلف مقامات پر ہو رہے ہیں خصوصاً ان کا جو مظاہرہ حال ہی میں جبل پور اور ساگر وغیرہ میں ہوا وہ تمام محبانِ وطن کی آنکھیں کھول دینے کیلئے کافی ہے۔"

سرکاری ملازمتوں کے متعلق قرارداد میں کہا گیا۔

"ہندوستان کے دستور کے آرٹیکل نمبر ۱۶ کی رُو سے کسی شہری کو مذہبی امتیاز کی بنیاد پر سرکاری ملازمت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن انڈین مسلم کنونشن، بہت افسوس کے ساتھ اس بات کو محسوس کرتا ہے کہ سرکاری و نیم سرکاری ملازمتوں میں ہر درجہ میں مسلمانوں کی تعداد برائے نام ہے۔ یہ عملاً دستور سے سرتابی اور سیکولرازم کی نفی کے مرادف ہے۔ اس لئے انڈین مسلم کنونشن، مرکزی حکومت اور تمام ریاستی حکومتوں سے پرزور مطالبہ کرتا ہے کہ

(۱)۔ مرکزی اور ریاستی سطح پر ان تمام اسباب و علل کی تحقیقات کرائی جائے، جن کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان ضروری قابلیت کے باوجود، اعلیٰ سول اور پولیس اور دفاعی ملازمتوں سے خصوصاً اور ادنیٰ سرکاری ملازمتوں سے عموماً محروم رکھے جاتے ہیں۔"

بحالیات کے متعلق قرارداد میں کہا گیا کہ۔

"مسلمانانِ ہند کا یہ کنونشن، اس صورتِ حال پر افسوس اور غم کا اظہار کرتا ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد نکاسی جائیداد سے متعلق سخت گیرانہ قانون بنائے گئے اور ان کا سخت گیرانہ نفاذ کیا گیا جس کے نتیجہ میں مسلمانانِ ہند کو گذشتہ چودہ سال میں سخت مصائب اور تکالیف کا سامنا ہوا۔ اور بہت سے مسلمان اس کے سخت گیرانہ اور منتقمانہ نفاذ سے اپنے ملک میں رہتے ہوئے اپنے املاک سے محروم کر دیئے گئے۔ شخصی جائیدادوں کے علاوہ مسلمانوں کی مساجد، قبرستان، امام باڑے، درسگاہیں اور اوقاف ناجائز اور غیر قانونی طریق پر نکاسی جائیداد قرار دیدیئے گئے۔ یہ بات بھی نہایت افسوسناک ہے کہ بہت سے معابد، مساجد نیلام کر دیئے گئے۔ اس لئے حکومتِ ہند جلد سے جلد ان خانماں برباد مسلمانوں کے مکانات اور جائیدادیں انہیں واپس کرے اور نقصانات کا مناسب معاوضہ ادا کرے۔ نیز مسلمانوں کے مذکورہ مقدس مقامات مسلمانوں کو واگذار کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں حکومتِ مغربی بنگال کے موجودہ قانون کی جگہ دوسرا قانون جلد سے جلد بنایا جائے۔ حکومتِ ہند مغربی بنگال کی حکومت کے بجائے خود کارروائی کر کے خانماں برباد مسلمانوں کے مطالبات کی تکمیل کرے، نیز خانماں برباد مسلمانوں کی جائیدادوں کے سلسلہ میں تحقیقات کرائے۔ اور ٹیکس سرکاری کے سلسلہ میں عدالتی اور میونسپل بورڈوں کی جو کارروائیاں ہوئی ہیں انہیں کالعدم قرار دینے کے لئے اقدام کرے۔ مغربی بنگال کے خانماں برباد مسلمانوں کے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں لے۔"

ایک قرارداد میں صنعت و حرفت کے متعلق کہا گیا کہ۔

"یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ آزادی کے تیرہ سال گذر جانے کے باوجود، اقتصادی میدان میں مسلمانوں کو جو ہندوستان کی ایک بڑی اہم اقلیت ہیں، ایک طے شدہ سکیم کے تحت پسماندہ رکھا جا رہا ہے تجارت کے ٹھیکے، کارخانوں اور گھریلو صنعتوں اور دیگر معاشی امور میں ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی بنا پر مسلمان اِن میدانوں میں ترقی نہیں کر سکتے۔ پانچسالہ پلانوں کے امدادی منصوبوں اور امدادِ باہمی (کوآپریٹو) قرضے وغیرہ ملنا دشوار ہو گیا ہے۔" (بحوالہ مدینہ - بجنور ۱۷ ۶/۶۱)

یہ ہے ایک ہلکی سی جھلک، ہندوستان کے مسلمانوں کی حالتِ زار کی۔ ان کی یہ حالت تمدنی امور میں ہے۔ باقی رہا دین، سو اس کا وہاں تصوّر تک بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کا نظام سیکولر ہے، جس میں مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ شخصی معاملات میں مذہب کی مطابقت کی اجازت مل سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

یہ حالت ہے ان مسلمانوں کی جنھوں نے خود ہندوؤں کے اعتراف کے مطابق، ہمیشہ قومیت پرست ہندوؤں کا ساتھ دیا اور مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کی۔ آپ سوچئے کہ اگر (خدا نکردہ - خدا نکردہ) پاکستان کا مسلمان ان کے زیرِ حکومت

آجائے تو اس کا حشر کیا ہوگا؟ اندریں حالات، ہر سچے پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ ملک کے تخریب پسند عناصر کی ریشہ دوانیوں پر کڑی نگاہ رکھے اور مذہب کے نام پر نادانی اور سادگی سے ان کا آلۂ کار نہ بن جائے۔ سرزمین پاکستان کی حفاظت اور سالمیت ہمارا سب سے مقدم فریضہ ہے۔ اس لئے کہ اگر (خدانخواستہ) یہ سرزمین محفوظ نہ رہی تو، اسلامی نظام کا قیام تو کجا، ہماری دنیاوی زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا۔

فارمیکا

نقالوں سے بچیئے۔ آپ معمولی کوالٹی کا میٹیریل کیوں خریدیں؟

- "فارمیکا" کی ہر شیٹ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فارمیکا کا نام لکھا ہوا ہے۔
- لیمینیٹیڈ پلاسٹک شیٹوں میں سب سے بہترین اور پائیدار ہے۔
- "فارمیکا" لیمینیٹیڈ پلاسٹک شیٹوں میں ایک برانڈ کا نام ہے، جیسے "گولڈ فلیک" سگریٹوں میں
- ایک برانڈ کا نام ہے۔
- خریدنے سے پہلے "فارمیکا" کا نام ضرور دیکھ لیں۔
- "فارمیکا" میزوں کے لئے۔ ہوٹلوں۔ ہسپتالوں اور گھروں کیلئے لاجواب چیز ہے۔

سول ایجنٹس

ڈین اینڈ ویبر۔ ۲۔ میکلوڈ روڈ (متصل لاہور چرچ)۔ لاہور

ہیڈ آفس: کراچی — برانچ آفس: چٹاگانگ

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ (۳ / ۱۸)

اِسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟

طلوعِ اسلام کنونشن میں محترم پرویز صاحب کی تقریر

شائع کردہ

اِدارۂ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ لاہور

Saeed

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟

برادرانِ عزیز!

ایک اہم سوال جو اکثر ذہنوں میں ابھرتا اور دلوں کو پریشان کرتا ہے، یہ ہے کہ عام اخلاقی اقدار تمام مذاہب (بالخصوص بڑے بڑے مذاہب) میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ سب مذاہب یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ دیانت دار بنو۔ کسی پر ظلم نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اسلام بھی یہی کہتا ہے۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسی خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دینِ برحق صرف اسلام ہے۔ اس کے سوا خدا کے ہاں کوئی اور دین قابلِ قبول نہیں۔ نوعِ انسان کی نجات و سعادت اسی سے وابستہ ہے۔ اس لئے تمام اہلِ مذاہب کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام قبول کریں۔

اہم سوال اگر وہ خصوصیت جن کی بنا پر اسلام کو یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے، یہی اخلاقی اقدار ہیں، تو پھر یہ حق ہر ایک مذہب کو پہنچنا چاہیئے۔ یہ تو کوئی معقول بات نہ ہوئی کہ جن خصوصیات کی بنا پر ہم اسلام کو دین الحق قرار دیں، انہی کے مطابق جب دوسرے مذاہب اپنے متعلق ہی دعویٰ کریں تو ہم ان کے دعویٰ کو باطل قرار دے دیں اور ان سے اسلام قبول کرنے کا مطالبہ کریں۔!

یہ سوال واقعی اہم ہے اور، جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، یہ اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا اور قلوب کو پریشان کرتا ہے۔ یہی وہ سوال ہے جو اس سے پہلے علمی دنیا میں اس وقت سامنے آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم) نے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا

برہمو سماجی مذہب کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں" اس لئے کسی مذہب کو دوسرے مذاہب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ یہ اعلان درحقیقت صدائے بازگشت تھی برہمو سماجی تحریک کی جو اس سے پہلے بنگال میں اٹھی تھی۔ انھوں نے تمام بڑے بڑے مذاہب کی (بمبینہ) آسمانی کتابوں سے (بزعم خویش) اچھی اچھی باتوں کو یکجا کر کے ایک مجموعۂ تعلیم مرتب کیا اور اسے دنیا کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اس تعلیم میں

تمام مذاہب کی مشترکہ سچائیاں موجود ہیں، اس لئے مذہبی اختلافات مٹانے اور سچائی پر عمل پیرا ہونے کا یہی طریق ہے کہ تمام اہلِ مذاہب اس تعلیم پر ایمان لے آئیں اور اسے اپنی زندگی کا نصب العین بنالیں۔ یہ مشترکہ تعلیم انہی اخلاقی اقدار پر مشتمل تھی۔ برہمو سماجی تحریک سے بہت پہلے اکبر کے "دینِ الٰہی" کی بنیاد بھی اسی تصور پر تھی۔ اسی کا مبلغ داراشکوہ تھا جس کے تصوف کی رُو سے "رام اور رحیم" میں کوئی فرق نہیں اور حقیقت کا جلوہ دیر و حرم میں یکساں موجود ہے۔ اسی کی صدائے بازگشت بھگت کبیر اور سورداس کے بھجنوں اور شاہ فرید اور سلطان باہو کی کافیوں میں ہر گلی کوچے میں سنائی دیتی ہے۔

مذہب کی بھی ضرورت نہیں!

اس سے ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر صداقت انہی اخلاقی اقدار کا نام ہے اور انہی پر عمل پیرا ہونا انسانی زندگی کا منتہیٰ ہے تو اس کے لئے .... مذہب کی بھی کیا ضرورت ہے۔ وہ لوگ جو کسی مذہب کے پیرو نہیں۔ جو خدا کی ہستی تک کے بھی منکر ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بہت بُرا ہے۔ سچ بولنا چاہیئے۔ دیانتدار بن کر جینا چاہیئے۔ کسی پر ظلم نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے مذہب کو بیچ میں لانے کی ضرورت کیا ہے؟ یہی وہ تصور تھا جس کی بنیادوں پر یورپ میں (Humanism) کی تحریک اُٹھی اور اس نے (Religion without Revelation)[1] "مذہب بلا وحی" کے دعوے کے ساتھ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اگر مذہب کا مقصود و منتہیٰ یہی اخلاقی اقدار ہیں اور انسانی زندگی ان اقدار کو مان لینے سے اپنی منزل تک پہنچ سکتی ہے تو پھر (Humanism) کے دعویٰ کو کس طرح ٹھکرایا جا سکتا ہے؟

آپ نے غور فرمایا کہ یہ سوال کس قدر اہم ہے اور اس کے اطمینان بخش جواب کا سامنے آنا کس قدر ضروری؟ اس اہمیت اور ضرورت کا تقاضا ہے کہ اس کے متعلق سنجیدگی سے (SERIOUSLY) سوچا جائے اور اسے انتہائی غور و فکر سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

دین کیا ہے؟

اس باب میں بنیادی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کو صرف ایک اخلاقی ضابطہ (ETHICAL CODE) سمجھ لیا جاتا ہے، اور بس۔ دین، چند اخلاقی اقدار کے مجموعہ کا نام نہیں۔ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی (SYSTEM OF LIFE) ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ اخلاقی اقدار اس نظام کے اندر بروئے کار آتی ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ یہ نظام، انسان کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جن پر اخلاقی اقدار کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ ساری

---

[1] یہ ہکسلے کی ایک کتاب کا نام ہے جس میں اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔

دنیا یہ کہتی ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے۔ بددیانتی سخت معیوب ہے۔ فریب دہی بڑی مذموم حرکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ساری دنیا جھوٹ بولتی ہے۔ بددیانتی عام ہو رہی ہے۔ فریب دہی کی گرم بازاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انسان ان تمام باتوں کو برا کہنے کے باوجود، انھیں کیوں اختیار کئے ہوئے ہے؟ وہ ان حرکات کو انتہائی معیوب اور مذموم سمجھنے کے باوجود انھیں کیوں نہیں چھوڑتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ یا تو ان اخلاقی اقدار کا محض سماً اور تقلیداً اقرار کرتے ہیں اور یا ان کی بنیاد محض جذبات پر ہوتی ہے۔ انہیں اس کا کچھ علم نہیں کہ ان اقدار کو کیوں اختیار کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیوں نہ کی جائے۔ آپ کسی شخص سے کہئے کہ وہ آپ کو مطمئن کرے کہ آپ جھوٹ کیوں نہ بولیں۔ سطحی گفتگو سے ذرا نیچے اُترنے کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اس کے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ وہ دلیل و برہان سے آپ کی "کیوں" کا کچھ جواب نہیں دے سکے گا۔ وہ آپ کو علیٰ وجہ البصیرت (RATIONALLY) نہیں سمجھا سکے گا کہ جھوٹ بولنے سے آپ کا کیا نقصان ہوگا اور سچ بولنے سے آپ کا کیا فائدہ ہوگا اور چونکہ انسان اُسی بات کو اختیار کرتا ہے جس میں اس کا فائدہ ہو اور اسی چیز کو چھوڑتا ہے جس میں اس کا نقصان ہو، اس لئے، اس کا یہ اصرار تو محض رسمی اور تقلیدی ہوتا ہے اور یا جذباتی عواطف کا پیدا کردہ۔ وہ نہ ان اقدار کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھتا ہے۔ اور اس لئے نہ انھیں اپنی زندگی کا مسلک بناتا ہے۔

دین وہ بنیادی تصورات عطا کرتا ہے جن کی رُو سے انسانی زندگی کا مقصد اور منتہیٰ نمایاں طور پر اس کے سامنے آجاتا ہے۔ مقصدِ زندگی، دنیا کی ہر شے کی صحیح صحیح قدر (VALUE) متعین کرتا ہے۔ اور جب اقدار متعین ہو جائیں تو پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ کس بات میں میرا نفع ہے اور کس میں نقصان۔ کونسی قدر زیادہ قیمتی ہے اور کونسی کم۔

ان بنیادی تصورات کے ساتھ، دین وہ عملی نظام عطا کرتا ہے جس میں یہ نظری اقدار، حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہیں اور ان کے محسوس نتائج سے انسان اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے کہ ان پر عمل پیرا ہونے سے کس قدر فائدہ ہوتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے کس قدر نقصان۔ اس سے اس کے جذبات و احساسات متاثر ہو کر اپنی کارفرمائی کے لئے صحیح راستہ (CHANNEL) اختیار کر لیتے ہیں۔ اور چونکہ عمل کے لئے قوت محرکہ انسانی جذبات ہیں، اس لئے اس کی زندگی ان بلند اقدار سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام کیریکٹر کی بلندی اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔

خواہش سے عمل تک

یاد رکھئے۔ انسانی سعی و عمل تین مراحل میں سے گزرتی ہے۔ آپ کے دل میں ایک خواہش پیدا ہوتی ہے۔ یہ خواہش (DESIRE) غیر شعوری طور پر دل میں بیدار ہوتی ہے۔ اس کے لئے آپ کے پاس کوئی دلیل و برہان یا وجہ جواز نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق خالص جذبات سے

ہوتا ہے۔ اس کے بعد آپ اسے عقل کے سامنے لاتے ہیں۔ اگر آپ کے جذبات شدید ہیں تو آپ کی عقل، اس خواہش کے بروئے کار لانے کے سامان سوچتی ہے اور اس کے جواز میں دلائل بہم پہنچاتی ہے۔ انہیں (Justificatory Reasons) کہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ کی عقل جذبات پر غالب ہوتی ہے تو وہ پھر نفع اور نقصان کا موازنہ کرتی ہے اور اگر دیکھتی ہے نفع کا پہلو زیادہ وزنی ہے تو اس خواہش کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اب آپ کی خواہش (Desire) آپ کی مرضی (Wish) میں بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ کی قوتِ ارادی آگے بڑھتی ہے اور اس خواہش کے پورا کرنے کے لئے عملی قدم اٹھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں آپ کی (Wish) ارادہ (Will) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

لیکن عقلِ انسانی؛ اگر وہ جذبات کے تابع نہ بھی ہو، تو بھی زیادہ سے زیادہ اس شخص کے ذاتی نفع یا نقصان کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ اس خواہش کے جائز یا ناجائز ہونے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔ بالفاظِ دیگر، انسانی عقل، فردِ متعلقہ کو یہ بتا سکتی ہے کہ کونسی بات میں اس کا فائدہ ہے اور کون سی بات میں نقصان۔ وہ حق اور باطل (Good and EVIL) میں تمیز نہیں کر سکتی۔ یہ تمیز صرف اقدار کے سامنے ہونے سے ہو سکتی ہے۔ اور جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، اقدار کا تعین، تصورِ حیات کی رو سے ہوتا ہے۔

تصورِ حیات (صحیح یا غلط) کس طرح انسانی نگاہ کا زاویہ بدل دیتا ہے اور اس کی سعی و عمل (Activities) کا رُخ متعین کر دیتا ہے، اسے سمجھنے کے لئے ہمیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔

تصوّرِ حیات کا اثر

آج ہر شخص کو شکایت ہے کہ دنیا میں جھوٹ۔ فریب۔ مکاری۔ دغابازی۔ بددیانتی۔ رشوت ستانی۔ بے انصافی۔ ظلم و استبداد۔ سلب و نہب (Exploitation) عام ہو رہے ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے گویا ان خرابیوں کے جراثیم وبائی امراض کی طرح ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں جن سے نہ کوئی خطۂ زمین محفوظ رہا ہے اور نہ اس خطہ میں بسنے والا کوئی فرد ان سے مامون۔ آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ اس کی بالآخر وجہ کیا ہے؟ برائیاں تو دنیا میں پہلے بھی تھیں لیکن وہ اس طرح عام اور ہمہ گیر نہیں تھیں۔ بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ اس کی وجہ وہ تصورِ حیات (Concept of Life) ہے جو انیسویں صدی میں سرزمینِ مغرب میں نمودار ہوا اور وسائلِ رسل و رسائل کے عام اور عالمگیر ہونے کی وجہ سے ساری دنیا میں پھیل گیا۔ یہ تمام خرابیاں اُس ایک تصورِ حیات کے برگ و بار ہیں۔ یہ تصورِ حیات یہ تھا کہ انسانی زندگی صرف اس کی طبیعی زندگی (Physical Life) ہے اور اس کی زندگی پر انہی قوانین و ضوابط کا اطلاق ہوتا ہے۔ جن کے مطابق باقی حیوانات جیتے اور مرتے ہیں۔ بقائے اصلح (Survival of the fittest) فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون کی رُو سے، زندہ رہنے کا اسی کو حق ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کر لے۔ یہ قوت کس طریق سے فراہم کی جائے، اس کا کوئی سوال ہی نہیں۔ ضعیف اور کمزور، صرف طاقتوروں کی خوراک بننے کے لئے زندہ رکھے جا سکتے ہیں۔ ہر بڑی مچھلی، چھوٹی مچھلی کو نگل لیتی ہے۔

کیڑے مکوڑے اسی لئے پیدا ہوتے ہیں کہ وہ چڑیوں کی غذا کا کام دیں اور چڑیاں اس لئے جیتی ہیں کہ وہ عقاب کا شکار بنیں۔ یہی قانونِ فطرت ہے۔ یہی آئینِ حیات ہے۔ اسی سے افراد اور اقوام کی موت اور حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ تقاضائے عدل ہے۔ جنگل کا بادشاہ شیر ہے۔ بکری نہیں۔ اگر شیر بکری کو کھا جاتا ہے تو اس سے بکری یہ شکایت نہیں کر سکتی کہ اس پر ظلم ہوتا ہے۔

حیوانات کی زندگی، جبلی تقاضوں (Instincts) کے زور پر بسر ہوتی ہے۔ یوں تو یہ تقاضے بہت سے ہیں، لیکن اصولی طور پر انہیں تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جذبۂ تحفظ خویش (Self-preservation) جذبۂ تغلب (Self - Assertion) اور جذبۂ افزائش نسل (Self - Reprodustion) جب انسانی زندگی کو حیوانی زندگی سے زیادہ کچھ نہ سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ ہر فرد، انہی جذبات کے تابع مفروض عمل رہے گا۔ اس میں اخلاقی اقدار کی گنجائش ہی نہیں ہو گی۔

اس تصور کی بنیادوں پر اٹھی ہوئی تہذیب کی رُو سے، بلند ترین کیریکٹر، نیشنل کیریکٹر قرار پائے گا۔

نیشنلزم غور سے دیکھئے تو نیشنل کیریکٹر بھی حیوانی جذبہ (Animal instinct) ہی کا پیدا کردہ ہے (Herd instinct) حیوانات کی جبلت میں ہے۔ ہر حیوان اپنی حفاظت اسی میں دیکھتا ہے کہ وہ گلہ کے ساتھ رہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس سے آجکل نیشن وجود میں آتی ہے اور قائم رہتی ہے۔ اپنی قوم کی بہبودی اور خوش حالی، افراد کے نزدیک بلند ترین قدر قرار پاتی ہے سب سے بڑا محب وطن وہ ہے جو دوسری اقوام کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر اس کی رنگینی سے اپنی قوم کے قصرِ بلند کی تزئین و آرائش کا سامان بہم پہنچائے۔ اس کے لئے دیانت اور بددیانتی۔ جھوٹ اور سچ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو شخص ان اقدار کا خیال کرنے بیٹھ جائے وہ امورِ مملکت کو سرانجام ہی نہیں دے سکتا۔ (walpole) کے الفاظ میں

> نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک بعض اوقات جانا ضروری ہو جاتا ہے، نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

اس ضمن میں ان محبانِ وطن (PAtriots) کو کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، اس کے متعلق اٹلی کے مشہور مدبر (CAVOUR) کے یہ چند الفاظ دہرا دینے کافی ہیں جس میں اس نے کہا ہے کہ

> اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم مملکت کے لئے کرتے ہیں تو کتنے بڑے شیاطین کہلائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک تصورِ حیات کے بدل جانے سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کس طرح بدل جاتی ہے اور اس تصورِ حیات کا اثر کس طرح اس کی زندگی کے ہر شعبے اور ہر گوشے کو متاثر کر دیتا ہے؟ یہ جو ابھی تک اخلاقی

اقدار کی زبانی تعریف ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے تحت الشعور کو اتنی جلدی ماضی کے اثرات سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ اگر یہ تصور حیات دو چار نسلوں تک اور آگے بڑھا تو اس کے ذہن سے ان اقدار کا تصور تک مٹ جائیگا اور پھر ان کا زبانی اعتراف بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس کے آثار ابھی سے نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ ہماری ابھرنے والی نسل ان اقدار کو دقیانوسیت قرار دیکر ان کا مذاق اڑاتی ہے۔

اسلام وہ تصورات دیتا ہے جن پر انسانی زندگی کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے اور اس کا ہر گوشہ بلند انسانی اقدار کا مظہر بن جاتا ہے۔ یہ تصورات، لامذہبیت میں تو ایک طرف، دنیا کے کسی مذہب میں بھی نہیں ملتے۔ یہی اسلام کی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر وہی اور صرف وہی دین الحق قرار پاتا اور انسانی فوز و فلاح کا ضامن بنتا ہے۔ اصولی طور پر یہ تصورات، حسب ذیل عنوانات سے متعلق ہیں۔

(۱) خدا کا تصور

(۲) خدا اور انسان کا تعلق۔

(۳) انسان اور کائنات کا تعلق

(۴) انسان اور انسان کا باہمی تعلق

(۵) اعمال اور ان کے نتائج کا تعلق

(۶) زندگی کے منتہیٰ و مقصود کا تصور

آئندہ صفحات میں انہی تصورات کے متعلق مختصر الفاظ میں بحث کی جائے گی اور بتایا جائے گا کہ دیگر بڑے بڑے مذاہب (ہندومت۔ یہودیت۔ عیسائیت) میں یہ تصورات کس قسم کے ہیں اور قرآن کس قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور ان تصورات کی رُو سے انسانی زندگی کا نقشہ کس قسم کا مرتب ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ اس وقت میرے پیش نظر مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ (COMPARATIVE STUDY OF RELIGIONS) نہیں۔ ان مذاہب میں، ان تصورات کے متعلق جو بنیادی عقائد ملتے ہیں، میں صرف انہی پر اکتفا کروں گا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارا ایمان ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ کو خدا کی طرف سے اپنے اپنے وقت میں، صحیح اور سچی تعلیم ملتی رہی تھی لیکن اہل مذاہب کی مرورِ زمانہ آسمانی کتابوں میں وہ تعلیم اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی۔ اس لئے ان تصورات کے متعلق جو کچھ کہا جائے گا وہ ان مذاہب کی موجودہ تعلیم پر مبنی ہوگا۔ ان کی اس اصلی اور حقیقی تعلیم پر نہیں جو اس وقت ان میں سے کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔ تفصیل اس اجمال کی میری کتاب معراج انسانیت کے پہلے باب میں ملیگی جس میں، خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیقات کے مطابق یہ بتایا گیا ہے کہ ان مذاہب کی اصلی تعلیم ان کے ہاں کہیں باقی نہیں رہی۔ لیکن چونکہ یہ حضرات اپنی موجودہ تعلیم کو اپنے مذہب کی بنیاد قرار دیتے ہیں اس لئے ان تصورات

کے متعلق ان کی اسی تعلیم کو سامنے لایا جائے گا۔ اس کے سوا کوئی دوسری شکل ہو بھی نہیں سکتی۔

---

(۱) خدا کا تصوّر

ان ہر سہ مذاہب (ہندومت۔ یہودیت۔ اور عیسائیت) میں ہندو دھرم کا دعوے ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین مذہب ہے۔ اس کی قدامت کا ثبوت ان کی مروجہ مذہبی کتابیں بہم پہنچا رہی ہیں جن کا ایک ایک ورق اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ یہ اس زمانے کی تصنیف ہیں جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا۔ بچپن کا ذہن، کسی مجرد حقیقت (Abstract Reality) کا تصور، محسوس پیکروں سے الگ ہٹ کر، کرہی نہیں سکتا۔ اس لئے اُس زمانے کا انسانی ذہن، خدا کی ذات کے متعلق منزہ تصور کیسے قائم کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کو اپنی شکل پر ڈھالا اس فرق کے ساتھ کہ انسان کے (مثلاً) دو ہاتھ ہیں تو خدا کے آٹھ ہاتھ سمجھ لئے۔ انسان کا ایک سر ہے، خدا کے دس سر تصور کر لئے۔ انسان پیالہ پانی پی سکتا ہے، خدا پورا سمندر اپنے اندر انڈیل سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں

ہندومت میں خدا کا تصوّر

تین بنیادی خدا مانے جاتے ہیں۔ برہما۔ شوجی۔ اور وشنو۔ ان کی بیویاں بھی ہیں اور بچے بھی۔ شیو جی کی بیوی پاربتی اور ان کا بیٹا گنیش، جس کا جسم انسان کا اور سر ہاتھی کا ہے۔ برہما کی بیٹی سرسوتی۔ پہلے ان تینوں خداؤں کی پرستش ہوتی تھی لیکن اب برہما کی پرستش نہیں ہوتی۔ پرانوں میں ہے کہ ایک دفعہ شوجی نے دیکھا کہ برہما اپنی لڑکی سرسوتی سے فعل شنیع کا مرتکب ہونا چاہتا ہے اس لئے اس نے اس کی پرستش بند کر دی۔

(ہندوازم صفحہ ۱۰۳ مصنف گووند داس)

تخلیق کائنات کے متعلق، شوپران میں حسب ذیل بیان ملتا ہے۔

شوجی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کردوں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چلو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بلبلا اٹھا۔ بلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا کہ آ رے بیٹے دنیا کو بنا۔" برہما نے کہا "میں تیرا بیٹا نہیں۔ تو میرا بیٹا ہے۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہادیو (شوجی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا وہ فوراً آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران ہو گئے۔

اس کے بعد سنئے کیا ہوا۔

دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیئے۔ جو پہلے آئے وہ باپ جو پیچھے آئے وہ بیٹا کہلائے۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا۔ برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا اگر وشنو پتہ لے آیا ہوگا تو مجھے اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اس وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اُترا۔ برہما نے ان سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلتے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انھوں نے کہا نہیں۔

برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر اس کی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ گواہی نہیں دو گے تو میں تمھیں ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہو ویسی ہی گواہی دیدیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے پوچھا کہ تم نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھائے گا اس کا ستیاناس ہو جائے گا۔ گائے کو بد دعا دی کہ جس مُنہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے اُس منہ سے تو پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے مُنہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دُم کی کریں گے۔ برہما کو بد دعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہوگی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہوگی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد و ثنا کی۔

اس حمد و ثنا کو سُن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک رکھ کا گولا نکالا اور کہا۔ جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔[1]

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش۔ سوامی دیانند۔ صفحہ ۲۷۳-۲۷۲)

---

[1] کہہ دیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبی لٹریچر میں بھی بہت سی توہم پرستانہ خرافات مل سکتی ہیں۔ لیکن سوال عام مذہبی لٹریچر کا نہیں۔ بلکہ ان کتابوں کا ہے۔ جنہیں اہل مذاہب بطور سند پیش کریں۔ ہمارے ہاں دین میں سند صرف قرآن کریم ہے جو ان چیزوں سے بہت بلند اور منزہ ہے۔

خدا کا تصور وہ بلند ترین آئیڈیل ہوتا ہے جسے کوئی قوم اپنے سامنے رکھتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس قوم کے سامنے خدا کا یہ تصور ہو اس کے اعمالِ حیات کس قسم کے ہو سکتے ہیں! نہ اس قوم کا ذہن توہم پرستی سے نجات حاصل کر سکتا ہے، نہ ان کے اعمال کا مدار علم و بصیرت قرار پا سکتا ہے۔ وہ جس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں وہ بھی انسانی پیکر سے بلند نہیں ہوتا۔ چنانچہ اتھروید میں ہے کہ خدا کی پوجا پاٹ کے وقت یہ کہنا چاہیئے کہ

اے جیئوں کے سوامی پرماتما! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار (سجدہ) ہے۔ تیری آنکھوں کو نمسکار ہے۔ تیری چمڑی کو نمسکار ہے۔ تیرے انگوں (اعضا) کو نمسکار ہے۔ تیرے پیٹ کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کی گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔

یہودیوں کے ہاں خدا کا تصور

ہندو مت کے بعد، اب یہودیت کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں خدا کا تصور کس قسم کا ملتا ہے۔ غالباً لاک (Locke) نے کہا تھا کہ تم مجھے بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لئے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا تھا اور میں یہ بتا دوں گا کہ اس قوم کی تہذیب اور اس کا تمدن کس قسم کا تھا۔ مروجہ تورات کے مطالعہ سے خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے، اس کے متعلق ایک مغربی محقق کا پیش کردہ جائزہ سامنے لے آنا کافی ہوگا۔ (Joseph whebs) اپنی کتاب (IS IT GOD'S WORDS) میں لکھتا ہے۔

تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبے میں ایک خونخوار عفریت۔ گنہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک۔ ظلم اور تعصب کا مجسمہ۔ متکبر، شیخی باز۔ وعدہ خلاف۔ غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔ (بحوالہ معراج انسانیت صفحہ ۳۲)

تورات میں ہے کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر پیدا کیا۔ اب ظاہر ہے کہ جس خدا کی اس قسم کی شکل ہو، اس کی پیدا کردہ قوم کی شکل بھی ایسی ہی ہوگی۔ یہ خدا کی شکل نہیں بلکہ اس قوم کی اپنی سیرت کا بیان ہے۔ خدا کے اس قسم کے تصور کے بعد، اخلاقی اقدار کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کے لئے کسی صراحت اور وضاحت کی ضرورت نہیں۔

عیسائیت میں خدا کا تصور

یہودیت سے آگے بڑھ کر عیسائیت کی طرف آیئے تو وہاں خدا کے تصور کی چیستاں سمجھ میں ہی نہیں آتی۔ کونسل اوف ٹرنٹ نے عیسائیت کے بنیادی عقیدے کے لئے جو نظریہ تجویز کیا تھا اور جس کے اقرار سے ایک شخص عیسائی بنتا ہے، حسب ذیل ہے۔

ہم ایمان لائے (۱) خدا، قدرت والے باپ پر جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے۔ اور ہم ایمان لائے

ہمارا رب یسوع ابن اللہ ہے جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ یعنی خدا کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے۔ عین خدا ہے۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئی۔ ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا۔ وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے مصیبت ہوا۔ اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا۔ اور آسمان پر چڑھا۔ اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے کے لئے پھر دنیا میں آئے گا۔

یہ تو رہا حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ۔ ان کی والدہ ماجدہ، حضرت مریمؑ کے متعلق مقدس کلیسا کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ خدا کے نزدیک بڑی قوتوں کی مالکہ ہے۔ وہ جو کچھ مانگتی ہے اسے دیا جاتا ہے۔ وہ ہمارے لئے سرچشمۂ خیر ہے کیونکہ وہ ہمارے خدا سے مانگتی ہے۔ چونکہ وہ خدا کی ماں ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو مسترد نہیں کر سکتا۔ اور چونکہ وہ ہماری بھی ماں ہے، اس لئے وہ ہماری سفارش سے انکار نہیں کر سکتی۔۔۔۔ ہم اپنی نجات کے لئے جو دعائیں اس سے کرتے ہیں وہ مستجاب ہوتی ہیں۔

(بحوالہ شعلۂ مستور صفحہ ۱۲۹) (catholic School Book. P. 158)

چنانچہ اب حال ہی میں، پوپ کی مجلس نے فیصلہ کیا ہے کہ باپ۔ بیٹا اور روح القدس کے ساتھ حضرت مریمؑ کی بھی پرستش کی جایا کرے۔

قرآن کا دیا ہوا تصور

خدا کے ان تصورات کے بعد اب قرآن کریم کی طرف آئیے۔ اس نے سب سے پہلے ان تمام تصورات کی یہ کہہ کر تردید کر دی کہ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ (۲۳/۹۲) یہ لوگ خدا کے متعلق جو تصورات اپنے ذہن سے پیش کرتے ہیں، وہ ان سے بلند اور پاک ہے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے تم اس کا ادراک نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ تم انہی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہو جو محسوسات کے دائرے میں آسکیں اور خدا کی ذات اس سے ماورا ہے۔ لہٰذا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۔ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۔ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ (۶/۱۰۴) انسانی نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں۔ وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔ وہ بہت لطیف و خبیر ہے۔ اس کی ذات کو کسی مثال سے بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔ اس لئے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۴۲/۱۱) اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ (۱۱۲/۳) نہ وہ خود کسی کا بیٹا۔ نہ کوئی اس کا بیٹا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (۱۱۲/۴)۔ نہ کوئی اس کا ہمسر۔ وہ یکسر یگانہ اور بے مثل و بے نظیر ہے۔

اس کی ذات کے متعلق تو ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ البتہ اس نے جو اپنی صفات بیان کی ہیں ان سے خدا کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے بلند، پاکیزہ، باعظمت اور حسین تصور ہو ہی نہیں سکتا۔

۲۔ خدا اور انسان کا تعلق

سوال یہ ہے کہ خدا کی ان صفات پر ایمان لانے سے فائدہ کیا ہے۔ ایک شخص

تسلیم کرتا ہے کہ خدا کی یہ صفات ہیں۔ دوسرا اس سے انکار کرتا ہے۔ اُس اقرار اور اس انکار سے ان کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسانی پیکر روحِ خداوندی کا حامل ہے جسے انسانی ذات (Human personality) کہا جاتا ہے۔ انسانی ذات میں اس کا امکان رکھ دیا گیا ہے کہ وہ (علیٰ حد بشریت) ان خدائی صفات کو اپنے اندر اجاگر کرتی جائے۔ یہی وہ خدا کا رنگ ہے جس سے حسین تر رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ (صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔ ۲/۱۳۸) اس اعتبار سے، خدا کی یہ صفات، انسانی ذات کی نشوونما کے لئے ایک خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں۔ یہ وہ (IDEAL) ہے جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو ڈھالنا چاہتا ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس پر وہ پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس خارجی معیار پر ہر آن اپنے آپ کو ماپتا جاتا ہے اور اس طرح علیٰ وجہ البصیرت پہ کہتا جاتا ہے کہ اس کی ذات کی کس حد تک نشوونما (Development) ہوئی ہے۔ اور اس میں ہنوز کیا کمی ہے۔

اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ کس موقع پر خدا کی کونسی صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ تاکہ ایسے موقع پر انسان کی طرف سے بھی اسی قسم کی صفت کا ظہور ہو۔ اس سے یہ متعین ہوتا ہے کہ خارجی واقعات و حوادث پر انسان کا ردعمل کیا ہونا چاہیئے۔ یاد رکھئے۔ جس طرح انسان کے لئے صفاتِ حسنہ کا حامل ہونا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ کسی واقعہ پر انسان کی طرف سے اُسی صفت کا ظہور ہو جو اس کے لئے مناسب اور موزوں (Appropriate) ہو۔ شقی القلب ظالم پر، جس کے دل میں نہ احساسِ ندامت ہو نہ آرزوئے اصلاح، ترس کھا کر اسے کھلا چھوڑ دینا، مظلوم انسانوں پر بے انتہا ظلم ہے۔ لیکن جہاں عفو اور درگذری سے خوشگوار نتائج متوقع ہوں، وہاں بدلہ لینا ظلم کے مرادف ہو جاتا ہے۔ عضلات (Muscles) کی چوٹ آہستہ آہستہ مالش سے ٹھیک ہو جاتی ہے۔ لیکن ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو سخت لکڑی کی تختیوں (Splints) سے کس کر باندھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے جباریت کہتے ہیں (جراح کی ان لکڑیوں کو جبائر کہتے ہیں)، قرآن کریم ان صفات خداوندی اور انکے مواقع ظہور و اطلاق کو بڑی شرح و بسط سے بیان کرتا ہے تاکہ وہ جہاں ایک فرد کی ذات کی نشوونما کا معیار ہیں، وہاں یہ بھی بتائیں کہ انسان کیطرف سے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل ہونا چاہیئے۔

اسی سے ایک اور اہم حقیقت سامنے آتی ہے۔ مذہب میں خدا کا تصور ایک مستبد بادشاہ (Autocrate King) اور مطلق العنان آمر (DICTATOR) کا ہوتا ہے، جس کے تمام فیصلے اس کی مرضی پر منحصر ہوتے ہیں اور ان میں کسی قاعدے اور قانون کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ خوش ہو گیا تو مجرم کو خلعت بخش دی۔ ناراض ہو گیا تو بے گناہ کو حوالۂ دار و رسن کر دیا۔ انسان کی خیریت اسی میں ہے کہ جس طرح ہو سکے اس خدا کو خوش رکھے۔ وہ اس کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے جتن کرتا ہے۔ اس کے حضور نذرانے گزارتا ہے۔ اس کے مقربین کے وسیلے حاصل کرتا ہے۔ اس تک سفارشیں پہنچاتا ہے۔ اس کی ناراضگی سے ہر وقت ڈرتا ہے اور اس ڈر سے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ ان احکام کی فرماں برداری سے انسان کا اپنا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے مقصود صرف "خدا" کی خوشنودی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ دوسری طرف، عیسائیت ہے۔ جہاں خدا کا تصور ایک رقیق القلب باپ کا ہے۔ وہاں بھی قاعدے اور قانون کا کوئی واسطہ نہیں۔ وہاں نجات کا

قانون کا خدا

مدار خدا کے رحم پر ہے۔

قرآن نے آکر اس تصور کی بھی تردید کی اور کہا کہ خدا نے، اپنی لامحدود قوتوں اور بے انتہا اختیارات کے باوجود، ہر کام کے لئے قاعدے اور قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور وہ سب کچھ ان قوانین کے مطابق کرتا ہے۔ یہ قوانین اس قدر اٹل ہیں کہ ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا وَ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا (۳۵/۴۳) قانون کے معنی یہ ہیں کہ یہاں ہر بات (CAUSE AND EFFECT) علت اور معلول کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے۔ یعنی اگر فلاں کام کروگے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ اگر اس کی خلاف ورزی کروگے تو اس کا انجام یہ ہوگا۔ اس نے انسان کو یہ تمام قوانین بتا دیئے۔ اچھی طرح سمجھا دیئے۔ اس پر واضح کر دیا کہ اس قانون پر عمل کرنے سے اس کا یہ فائدہ ہوگا اور اس کی خلاف ورزی سے اس کا یہ نقصان ہوگا۔ یہ سب کچھ بتا دینے کے بعد اس سے کہہ دیا کہ اب تمہارا جی چاہے تو یہ راستہ اختیار کر لو اور جی چاہے تو اس کے خلاف چلے جاؤ۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ۔ اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا (۷۶/۳) "ہم نے اسے راستہ دکھا دیا ہے۔ اب وہ چاہے اسے اختیار کرے اور چاہے اس سے انکار کر دے۔" وہ صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اس سے اسی کا فائدہ ہوگا۔ ہمارا کچھ نہیں سنورے گا۔ غلط راستے پر چلے گا، تو وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ ہمارا کچھ نہیں بگاڑے گا۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (۲/۲۸۶) یہی وجہ ہے کہ خدا کسی بات کو حکماً اور جبراً نہیں منواتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے مشورۃً کہتا ہے۔ اس نے قرآن نازل کرنے کے بعد کہہ دیا کہ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (۱۸/۲۹)۔ ان سے کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آگیا۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔ ظاہر ہے کہ جس بات کے ماننے، نہ ماننے کا فیصلہ انسان پر چھوڑ دیا گیا ہو، اگر وہ صاحب عقل و ہوش ہے تو وہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرے گا۔ لہٰذا، قرآن کی رُو سے ایمان، اندھے یقین (Blind Faith) کا نام نہیں۔ یہ اس ذہنی اور قلبی اطمینان (Conviction) کا نام ہے جو انسان کو علیٰ وجہ البصیرت حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مؤمنین کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (۲۵/۷۳) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب (اور تو اور) خود ان کے رب کی آیات بھی ان کے سامنے لائی جاتی ہیں تو وہ ان پر بہرے گونگے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انھیں عقل و بصیرت سے قبول کرتے ہیں۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اعمال کے نتائج، قاعدے اور قانون کے مطابق مرتب ہوتے ہوں، تو اس میں کسی کے فدیہ دے کر چھوٹ جانے یا سفارش سے رہا ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر آپ اپنی انگلی آگ میں ڈال لیں اور اس کے بعد ہزار روپیہ دیکر بھی چاہیں کہ جلنے کا درد آپ کی جگہ کسی اور کو ہو جائے تو یہ ناممکن ہوگا۔

اگر آپ سنکھیا کھالیں تو چاہے آپ گورنر جنرل کی سفارش بھی کیوں نہ لے آئیں، آپ اس کے مُضر اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتے اس کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ آپ خدا کے اس قانون کی طرف رجوع کریں جس کے مطابق، جلنے کے درد کو آرام اور سنکھیا کے ہلاک اثرات سے حفاظت مل سکتی ہے۔ انسان کو تکلیف اور راحت، اس کے اعمال کے نتائج میں، خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّ يَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ (۸/۴۲) تاکہ جو ہلاک ہوتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے ہلاک ہو اور جو زندہ رہتا ہے وہ بھی دلیل و برہان کی رُو سے زندہ رہے۔ نہ کوئی بے گناہ مستبد حاکم کے غصے اور جذبۂ انتقام سے سزا پاتا ہے اور نہ ہی مجرم، فدیہ۔ کفارہ یا سفارش سے چھوٹ سکتا ہے۔ اسی لئے ان لوگوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ (۲/۴۸)۔ ظہور نتائج کے وقت کوئی شخص کسی دوسرے کے کام نہیں آسکے گا۔ نہ ہی کسی کی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ ہی کوئی معاوضہ دے کر چھوٹ سکے گا نہ ہی مجرمین کی کوئی مدد کر سکے گا۔

آپ نے غور کیا کہ "قانون والے خدا" کا تصور دے کر قرآن کریم نے کس طرح مذہب کو سائنس بنا دیا؟ سائنس کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس میں

(۱) ہر سبب (Cause) اپنا ایک مقررہ نتیجہ (Effect) پیدا کرتا ہے اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کر سکتا۔ اور

(۲) سائنس، انکشافِ حقیقت اس طرح کرتی ہے کہ اس پر کسی شخص کی خواہش، آرزو، مقصد، مفاد، جذبات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ وہ ان باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوتی۔

خدا کا جو تصور قرآن پیش کرتا ہے، اُس کی رُو سے اعمال اپنے نتائج بھی اسی طریق سے مرتب کرتے ہیں اور حقائق کا اظہار بھی اسی طرح کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے کہا ہے کہ ہمارا یہ پیغام "شاعری" نہیں۔ کالرج (Colerridge) نے ایک جگہ کہا ہے کہ شاعری کی ضد، نثر نہیں۔ سائنس ہے۔

(The Anti-Thesis of Poetry is not prose But Science

قرآن، شاعری نہیں، سائنس ہے۔

خدا اور انسان کے تعلق کے سلسلہ میں، قرآن کریم ایک اور عظیم حقیقت کی پردہ کشائی کرتا ہے۔ خارجی کائنات میں خدا کے قوانین از خود جاری و ساری ہیں۔ ان کے مطابق، ہر شے اپنے اپنے فریضہ کی تکمیل میں سرگرم عمل رہتی ہے اور کائنات اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انسانی دنیا میں بھی خدا کے قوانین اسی طرح نافذ العمل ہیں لیکن ان کی کائناتی رفتار بڑی سست ہے اور انسانی عمر کا تقاضا ہے کہ اعمال کے

نتائج جلد سامنے آجائیں۔ اگر انسانی دست و بازو، قوانین خداوندی کو سہارا دیں اور ان کے بروئے کار آنے میں مدد کا موجب بنیں، تو ان کے نتائج انسانی حساب و شمار کے مطابق مرتب ہو سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے، انسان، مشیت کے پروگرام کی تکمیل میں، خدا کا رفیق بن جاتا ہے۔ خدا اور انسان کا یہ وہ تعلق ہے جس کے متعلق "مذاہب کی دنیا" میں کہیں اشارہ تک نہیں ملتا۔ (چونکہ اس نکتہ کے متعلق، میں اس سے پہلے بہت کچھ لکھ چکا ہوں اس لئے اس مقام پر اس کی تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی)۔

۳۔ انسان اور کائنات کا تعلّق

خدا اور انسان کے تعلق کے بعد انسان اور کائنات کے باہمی تعلق کا سوال سامنے آتا ہے۔ جب ذہن انسانی اپنے عہد طفولیت میں تھا تو فطرت کی قوتوں کا راز اس کی سمجھ میں نہیں آسکتا تھا۔ وہ ان سے ڈرتا تھا اور ان کے غضب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ اس کے ذہن میں آسکتا تھا۔ یعنی ان کے سامنے گڑگڑایا جائے اور ان سے رحم کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ اس دور کے انسان کی حالت یہ تھی کہ بادل گرجا اور اس نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ بجلی کوندی اور یہ سجدے میں گر گیا۔ سورج چمکا اور اس نے اسے نمسکار کر دیا۔ زلزلہ آیا اور یہ ڈنڈوت بجا لایا۔ بپھرا ہوا دریا سامنے آیا اور اس نے اسے ماتا کہہ دیا۔ شیر دھاڑا اور اس نے اسے دیوتا بنا لیا۔ ہندومت انہی دیوی دیوتاؤں کا مجموعہ ہے اور انہی کی پرستش سکھاتا ہے۔ یجروید میں ہے۔

ہندو دھرم میں

زمین میں رہنے والے سانپوں کو سجدہ قبول ہو۔ جو سانپ ہوا میں یا آسمان پر ہیں ان کو ہمارا سجدہ ہو۔ جو سانپ دھانوں کے تیروں کے ساتھ آتے ہیں انھیں بھی سجدہ ہو۔ جو سانپ ابھی اپنے بلوں میں ہیں انھیں بھی ہمارا سجدہ قبول ہو۔

یہ تو پھر بھی زندہ قوتیں تھیں۔ وہ ان غیر ذی حیات چیزوں کو بھی سجدے کرتے تھے جن سے انھیں کسی نقصان کا اندیشہ ہوتا تھا۔ چنانچہ یجروید ہی میں دوسری جگہ ہے کہ حجامت بنواتے وقت یہ اشلوک پڑھنا چاہیئے۔

ہے استرے تو کلیان کاری ہے اور اچھے لوہے کا بنا ہوا ہے۔ تجھے ہمارا سجدہ قبول ہو۔ تو اس بالک کو تکلیف نہ پہنچائیو۔

اتھروید میں ہے۔

سردی والے بخار کو ہمارا سجدہ ہو۔ گرمی والے بخار کو بھی میں سجدہ کرتا ہوں۔ روزانہ، دوسرے اور تیسرے دن آنے والے بخار کو میرا سجدہ قبول ہو۔

ظاہر ہے (جس مذہب میں انسان اپنا مقام یہ سمجھے) اس میں شرف انسانیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں اس نے اگر جھوٹ نہ بولو۔ سچ بولو، کہہ بھی دیا تو کیا اس سے کائنات کی گتھیاں سلجھ جائیں گی اور انسانی معاملات (Human problems) کا حل مل جائے گا؟

یہاں سے اُتر کر دوسری طرف آیئے تو وہاں مادی کائنات اور اس کی آرائش و آسائش کی چیزوں کو یکسر قابل نفرت قرار دیا جاتا ہے، اور انسانی نجات کا راز ترکِ دنیا، ترکِ آرزو۔ اور ترکِ لذات میں بتایا جاتا ہے۔ جتنا کوئی دنیا سے دور بھاگے، اتنا ہی وہ خدا کا مقرب ہو جاتا ہے۔ رہبانیت اور خانقاہیت کی تعلیم عیسائیت کی اصل و بنیاد ہے۔

عیسائیت میں

(Saint Benedict) نے اسے ایک منظم ادارہ کی شکل دے کر تارک الدنیا راہبوں (Monks) اور راہبات (Nuns) کے غول کے غول پیدا کر دیئے۔ چنانچہ (Bucks) اپنی (THEOLOGICAL DICTIONARY) میں، مصر میں تحریک خانقاہیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ

> تھوڑے ہی عرصہ میں تمام مشرق سہل انگار انسانوں کی جماعتوں سے بھر گیا جنہوں نے تمام دنیاوی علائق سے قطع تعلق کر کے کرب واذیت اور مصائب و نوائب کی زندگی اختیار کر لی تاکہ اس کے ذریعے خدا اور عالم ملکوت سے قرب حاصل کیا جا سکے۔

اس قسم کی زندگی کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا، وہی ہوا۔ چنانچہ (Buck) اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

> لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان لوگوں کی شہوت پرستی ضرب المثل ہو گئی۔ نیز انھوں مختلف مقامات پر لوگوں کو مشتعل کر کے ہنگامے اور شورشیں برپا کرنا شروع کر دیں۔
>
> ان تارک الدنیا زاہدوں سے ایک دنیا تنگ آ رہی تھی۔
>
> لپٹ لپٹ کر مانگنے والے بھکاری، راہبوں کے لباس میں ہر گلی کوچے میں آوارہ پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ ہر قسم کی بدمعاشی اور فریب دہی ان کا شعار تھا..... یہ لوگ مذہبی جوش عقیدت کے نقاب میں بدترین لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کے مرتکب ہوتے تھے[1]۔

(Progress of Religious Ideas. Vol: 3. P. 240

---

[1] کہا جا سکتا ہے کہ خود مسلمانوں کی خانقاہوں اور تجرد گاہوں کے حالات بھی ایسے ہی ہیں۔ یہ ٹھیک ہے لیکن فرق یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ میں ترکِ دنیا کی تعلیم ان کا عین مذہب ہے۔ اور مسلمانوں میں یہ کچھ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف ہوتا ہے۔ ہم اس وقت ان مذاہب کی تعلیم کے نتائج کے متعلق بات کر رہے ہیں

جو لوگ اس قسم کی مذموم حرکات کے مرتکب نہیں ہوتے تھے، ان کی زندگی بھی عجیب وغریب انداز کی ہوتی تھی۔ عیسائیوں کے ہاں جو بڑے بڑے اولیاء (SAINTS) کا نام ملتا ہے ان کی کیفیت یہ تھی کہ کوئی قسم کھا لیتا کہ میں عمر بھر غسل نہیں کروں گا۔ کوئی اپنے آپ کو عمر بھر دلدل میں ڈالے رکھتا۔ کوئی غلاظت کے حصار میں بیٹھے رہنے میں روحانی ترقی کا راز سمجھتا۔ کوئی ساری عمر اندھیری کوٹھڑی میں پڑا رہتا۔ یہ تھا عیسائیت کی ترکِ دنیا کی تعلیم کا نتیجہ۔

قرآن آیا اور اس نے انسان سے کہا کہ تیرا مقام، فطرت کی قوتوں سے بہت بلند ہے۔ ان سب کو ہم نے قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے تاکہ تو ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔

قرآن کریم کی رُو سے

(اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) اللہ وہ ہے جس نے، کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ مقام آدم یہ ہے کہ تمام ملائکہ (فطرت کی قوتیں) اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں۔ اور مقام مومن یہ ہے کہ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں نوع انسان کی نفع رسانیوں کے لئے صرف کرے۔ محسوس کائنات میں انسان سے اوپر صرف مقامِ خداوندی ہے جس کے قانون کے مطابق اسے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اُس کے علاوہ، انسان سے برتر کوئی شے نہیں۔ دنیا کی زیبائش وآرائش کی چیزیں انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ انھیں کوئی قابل نفرت اور حرام قرار نہیں دے سکتا۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْۤ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت کی چیزوں کو جنہیں خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار رزق کو حرام قرار دے سکتا ہے؟

آدمی کا یہ مقام اور انسان اور کائنات کا یہ تعلق، "دنیائے مذاہب" میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ وہاں یا تو مظاہرِ فطرت کے سامنے جھک جانا ہوگا، یا ان سے دُور بھاگ جانا۔ انھیں مسخر کر کے تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف کرنا، صرف قرآن میں ملے گا۔

یاد رکھئے کہ قرآن کریم جب قوانین خداوندی کی اطاعت کا حکم دیتا ہے تو ان میں فطرت کے طبیعی قوانین بھی شامل ہوتے ہیں اور اخلاقی قوانین بھی۔ طبیعی قوانین کی اطاعت سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیں۔

(we obey Nature to command it)

اور اخلاقی قوانین کی اطاعت سے ہماری ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قوانین کی اطاعت، ہماری قوتوں میں اضافہ کا موجب بنتی ہے۔

می شود از جبر پیدا اختیار

۴- انسان اور انسان کا باہمی تعلق

انسان اور کائنات کے تعلق کے بعد، ہمارے سامنے انسان اور انسان کے باہمی تعلق کا سوال آتا ہے۔ ہندومت نے اس کے متعلق فیصلہ کر دیا کہ برہمن، برہما کے سر سے پیدا ہوتے ہیں۔ کھشتری اس کے بازوؤں سے۔ ویش اس کی ٹانگوں سے اور شودر اس کے پاؤں سے۔ یہ وہ ازلی تقسیم ہے جسے نہ دنیا کا کوئی نظام اُلٹ سکتا ہے اور نہ ہی انسان کی ذاتی کوششیں اس میں تغیر و تبدل کر سکتی ہیں۔ شودر کو ساری عمر اچھوت رہنا ہوگا۔ اس کا فریضہ، اونچی ذات کے ہندوؤں کی خدمت گزاری ہے۔ برہمن کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے دن سے مرتے وقت تک، بلند ترین مدارج اور حقوق کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے حقوق کی کیفیت یہ ہے کہ (رگ وید اور اتھروید کے حکم کے مطابق)

ہندو دھرم میں

> اگر کسی عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں لیکن اگر براہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے کیونکہ براہمن ہی عورتوں کا مالک اور خاوند ہے۔ نہ کہ کھشتری یا ویش۔
>
> (معراج انسانیت۔ صفحہ ۱۵)

یہ تقسیم بھی بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کی۔ باقی رہے اس کے باہر کے انسان سو وہ انسان نہیں بلکہ ملیکش سمجھے جاتے تھے۔ آپ سوچئے کہ جس مذہب میں، خود اپنے اہل مذہب کو اس طرح ورنوں کی نہ ٹوٹنے والی زنجیروں میں جکڑ دیا جائے، اور اس سے باہر کے انسانوں کو اس درجہ قابلِ نفرت و حقارت سمجھا جائے، اس میں جھوٹ نہ بولو اور چوری نہ کرو کا پرچار کیا اخلاقی اصلاح پیدا کر سکتا ہے؟

یہودیت میں

یہودیوں کے ہاں، مذہب بنی اسرائیل کی نسل کے اندر محدود تھا۔ کوئی شخص جو بنی اسرائیل کے ہاں پیدا نہ ہو، دینِ خداوندی کے اندر داخل کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ جنت صرف بنی اسرائیل کے لئے مخصوص تھی۔ غیر بنی اسرائیل سب جہنم کا ایندھن تھے۔ اپنی نسل سے باہر کے انسانوں کے خلاف ان کے دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات بھڑکتے رہتے تھے اور یہ سب (مروجہ) تورات کی تعلیم کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاں، یہودیوں کے لئے قانون اور تھا اور غیر بنی اسرائیل کے لئے اور۔

عیسائیت میں

عیسائیت کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ یہ تمام انسانوں کے لئے عالمگیر مذہب کی حیثیت رکھتی ہے اس میں، انسان اور انسان میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ لیکن یہ چیز، عیسائیت کی تعلیم نہیں بلکہ بعد میں سیاسی مصلحتوں کا پیدا کردہ تصور ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل میں (جو اگرچہ وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہے) ابھی تک یہ لکھا ملتا ہے کہ جب حضرت یسوعؑ نے اپنے حواریوں کو تبلیغ کے لئے بھیجا تو

انھیں حکم دیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی - باب صفحہ ۱۰ - آیات ۶ - ۵)

یہاں تک کہہ دیا کہ

پاک چیز کتوں کو نہ دو۔ اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی - باب ۷ آیت ۶)

یہ جو آپ یورپ میں نیشنلزم کی لعنت کو اس درجہ شدید دیکھتے ہیں، یہ غیر شعوری طور پر اسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ مذہب کو تو انھوں نے گرجا کی چار دیواری کے اندر محبوس کر دیا لیکن اس کی نسل پرستی کی تعلیم کے اثرات ان کے تحت الشعور میں اسی طرح موجود ہیں۔ ان کے سامنے عالمگیر انسانیت کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں اپنی قوم کے لئے اخلاقی اصول اور ہیں اور دوسری قوموں کے لئے اور۔ جس طرح رومنز کے ہاں یہ قانون تھا کہ کسی رومی کے ہاں چوری کرنا جرم ہے اور غیر رومی کے ہاں چوری کرنا کوئی جرم نہیں۔

قرآن کی رو سے

قرآن نے آکر، انسانوں کی ان خود ساختہ زنجیروں کو توڑا اور اعلان کر دیا کہ تمام دنیا کے انسان ایک ہی اصل کی شاخیں اور ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ انسان اور انسان میں پیدائش کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ (۴/۱) خدا نے تم سب کو ایک جرثومہ حیات (Life cell) سے پیدا کیا ہے۔ اس لئے تمام نوع انسان ایک عالمگیر برادری ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّةً وَّاحِدَةً (۱۰/۱۹) پوری کی پوری انسانیت (MANKIND) ایک قوم ہے۔ اور ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰)۔ ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔" کالے کو گورے پر۔ گورے کو کالے پر۔ عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فوقیت نہیں۔ یہاں نہ کوئی براہمن ہے نہ شودر۔ نہ کوئی جاتی اُونچ ہے نہ نیچ۔ سب انسان یکساں ہیں باقی رہے معاشرہ میں ان کے مدارج، سو اس کا معیار ان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار پر ہے۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا (۴۶/۱۹)۔ "ہر ایک کے درجات ان کے اعمال کی رو سے متعین ہوں گے" اور ان میں سب سے زیادہ واجب العزت وہ ہوگا جس کی سیرت سب سے پاکیزہ اور کردار سب سے بلند ہوگا۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (۴۹/۱۳) قرآن کا خدا، تمام نوع انسان کا یکساں رب، مالک اور الٰہ ہے (قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔ مَلِكِ النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (۱۱۴/۱-۳) اس خدا کی کتاب بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ (۴۵/۲۰) تمام نوع انسان کے لئے مجموعۂ بصائر و حکم۔ اس کا رسول، تمام نوع انسان کے لئے یکساں رسول۔ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (۷/۱۵۸) " ان سے کہہ دو کہ اے تمام دنیا کے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں" اس کی تعلیم کا خلاصہ یہ کہ دنیا میں ثبات و دوام صرف اس نظریہ یا عمل کو حاصل ہو سکتا ہے، جو بلا تفریق رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب، قومیت، تمام نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہے۔

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ (۱۳/۱۷) "زمین میں باقی وہی رہتا ہے جو انسانیت کے لئے نفع بخش ہو" جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، مغربی تصورِ حیات نے بقائے اصلح (Survival of The Fittest) کا اصول دیا۔ یعنی باقی وہی رہ سکتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ قرآن نے اس کی بجائے "بقائے انفع" کا اصول دیا۔ یعنی باقی وہ رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ آپ نے غور کیا کہ اس ایک تصورِ حیات کے بدل جانے سے، انسانی زندگی کے تمام گوشے کس طرح بدل جاتے ہیں اور اس سے دنیائے انسانیت میں کس قدر حیات افروز اور حسن افزا تبدیلی آجاتی ہے؟ یہی وہ تصورِ حیات ہے جس سے انسان کی سمجھ میں یہ بات آسکتی ہے کہ میں دوسروں کی بہتری کے لئے کیوں کوشش کروں؟ حیاتِ دوام حاصل کرنا، ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ہمیشہ زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے کام کرو جو عالمِ انسانیت کے لئے زیادہ سے زیادہ منفعت بخش ہوں۔ دوسرے کی ضرورت شدید ہو، تو اسے اپنے آپ پر ترجیح دو۔ (یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) مومن وہ ہیں جو خود تنگی میں رہتے ہیں اور دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں)۔ اور یہ سب کچھ بغیر کسی ذاتی غرض کے خیال سے کرو۔ وہ کہتا ہے کہ مومن جب دوسروں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتے ہیں تو اُن سے واضح الفاظ میں کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا (۷۶/۹) ہم تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ تم سے شکریہ تک بھی نہیں چاہتے۔

سوچئے کہ اس تصورِ حیات کی رُو سے، اخلاقی اقدار کس طرح زندگی کا معمول بن جاتی ہیں۔

انسانی مساوات کے تصور کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے ایک ایسا معاشرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کا غلام ہونا تو ایک طرف، کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کسی کا محتاج۔ اس سے ایک ایسا نظام قائم ہوتا ہے جس میں تمام افراد، قوانینِ خداوندی کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے زندگی کے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں۔ (وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۴۲/۳۸)

قرآنی نظام

یہ نظام ہر فرد کو اس کی ضمانت (گارنٹی) دیتا ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ (۶/۱۵۱) ہم تمہارے رزق کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کے رزق کے بھی"۔ کہیئے! اس نظام میں کسی کو جھوٹ بولنے یا چوری اور بددیانتی کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے؟ اس میں اخلاقی اقدار خود بخود بروئے کار آتی چلی جاتی ہیں۔ اس نظام میں نہ کسی کو خدائی اختیارات (Divine Rights) حاصل ہوتے ہیں۔ نہ مذہبی پیشواؤں کا وجود باقی رہتا ہے۔ نہ ملوکیت نظر آسکتی ہے نہ سرمایہ داری۔ "دنیائے مذاہب" میں اس قسم کا نظام تو ایک طرف، سرے سے نظام کا

تصور ہی نہیں ملتا۔

نظام کے تصور سے، قرآن کریم نے ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کیا ہے جو "دنیائے مذاہب" میں بہت بڑا انقلاب ہے۔ اس نے کہا ہے کہ نوع انسان کی راہ نمائی کے لئے جن غیر متبدل اصولوں کی ضرورت تھی، وہ قرآن میں دیدیئے گئے اور ان کی حفاظت کا بھی انتظام کر دیا گیا۔ ان اصولوں کی روشنی میں، ہر آنے والی نسل، اپنے معاملات، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، خود حل کرے گی۔ اس لئے اب کسی نبی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا باب نبوت کو بند کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے غور کیا کہ ختم نبوت، دنیائے مذاہب میں کتنے عظیم انقلاب کا اعلان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ اس حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ اب ذہنِ انسانی، اپنے عہد طفولیت سے نکل کر سن شعور میں پہنچ گیا ہے۔ انسان اب بچہ نہیں رہا، بالغ ہو گیا ہے۔ اس لئے اب اسے کسی "آکر اٹھانے والے" کی احتیاج نہیں رہی۔ اسے اب خود اٹھنا اور آگے چلنا ہو گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس سے انسان میں کس قدر خود اعتمادی (self - confidence) پیدا ہوتی ہے اور وہ کس طرح دنیا میں گردن اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔!

ختم نبوت

دنیا کا ہر مذہب، کسی آنے والے کا انتظار کر رہا ہے جو آکر اس مذہب کو دوسرے مذاہب پر غلبہ عطا کرے گا۔ قرآن نے اس تصور کی تردید کر کے کہدیا کہ ہم نے جو نظامِ زندگی تمہیں دیا ہے اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ دنیا کے تمام نظامہائے زندگی پر غالب آجائے۔ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ۔ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳) تم اس نظام کو عملاً متشکل کر دو۔ یہ انسانوں کے تمام خود ساختہ نظامہائے حیات پر غالب آجائے گا۔ اس کے سامنے کوئی دوسرا نظام ٹھہر نہیں سکے گا۔

قرآن، اخلاقی اقدار پر زور دینے کے ساتھ ساتھ اس نظام زندگی کی اقامت کی تاکید کرتا ہے جس میں اخلاقی اقدار خود بخود غالب آجاتی ہیں۔

۵۔ انسانی زندگی کا منتہیٰ (نجات)

اس کے بعد، آپ اُس سوال کی طرف آیئے جو اس بحث میں حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسانی زندگی کی تمام تگ و تاز کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے؟ یہ بڑا اہم اور بنیادی سوال ہے اور اس سے بہت سے متعلقہ گوشے خود بخود واضح ہو جائیں گے۔

دنیا کے تمام مذاہب میں، انسانی زندگی کی تمام سعی و کاوش کے منتہیٰ کو ایک لفظ میں بیان کیا جاتا ہے۔ اور

وہ لفظ ہے "نجات" ۔۔۔ مکتی (SALVATION)۔ نجات سے مفہوم کیا ہے، یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ہے۔ یہ واضح ہے کہ جب کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو اور اُسے اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے تو اُسے نجات کہتے ہیں۔ یعنی نجات کے لئے ضروری ہے کہ وہ شخص پہلے کسی مصیبت میں مبتلا ہو۔ مذہب کی دنیا میں انسان کے متعلق یہی بنیادی تصور ہے۔

ہندو دھرم میں

ہندومت (دھرم - یعنی شریعت) میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر ذی حیات (جاندار، خواہ وہ کیڑے مکوڑے ہوں، یا حیوانات اور انسان) اپنے سابقہ جنم کے کرموں (اعمال) کی سزا بھگتنے کے لئے دنیا میں آتا ہے۔ مثلاً ایک شخص موجودہ جنم میں انسان ہے۔ اس نے برے کام کئے تو وہ اگلے جنم میں چوہا بن جائے گا۔ چوہے کو قطعاً معلوم نہیں کہ وہ کس جرم کی پاداش میں چوہا بنا دیا گیا ہے۔ اب اگر وہ چوہا نیک کام کرے گا ۔۔۔ چوہا نیک کام کرے گا؟ گویا جانور بھی نیک کام اور بُرے کام کرتے ہیں!! ۔۔۔ تو وہ آئندہ جنم میں (شاید) پھر انسان بن جائے۔ ہر انسان اس آواگون (Transmigration) کے چکر میں پھنسا ہوا ہے، اس چکر سے چھٹکارا مل جانے کا نام نجات ہے۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ عقیدہ یا تو توہم پرستی کی پیداوار ہے اور یا ان لوگوں کے ذہن رسا کی تخلیق جنہوں نے کسی نہ کسی طرح معاشرہ میں اقتدار حاصل کر لیا اور اس کے بعد چاہا کہ وہ اقتدار انہی کے گھرانوں میں مخصوص رہے۔ دوسرے لوگ اس اقتدار کے حصول کا خیال تک دل میں نہ لائیں۔ براہمن اور کھشتری حکمران طبقے تھے۔ اور ویش اور شودر ان کے خدمت گزار۔ ہو سکتا تھا کہ کبھی کسی ویش یا شودر کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ براہمنوں اور کھشتریوں کے بچوں کو کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں کہ یہ پیدائش کے ساتھ ہی حکمران بن جائیں اور ہم ان کی غلامی کرتے رہیں۔ اس لئے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ براہمن کے گھر میں پیدا ہی وہ ہوتا ہے جس نے پچھلے جنم میں اچھے کام کئے ہوں اور ویش اور شودر کے ہاں وہی پیدا ہوتا ہے جس نے سابقہ جنم میں برے کام کئے ہوں۔ لہٰذا یہ تقسیم اعمال کے نتائج کے اعتبار سے عمل میں آتی ہے۔ یونہی دھاندلی سے پیدا نہیں کر دی گئی۔ انہیں اس زندگی میں بہر حال ویش اور شودر رہنا ہوگا۔ البتہ اگر وہ اچھے کام کریں گے (یعنی اُتم جاتی کے لوگوں کی خدمت کرتے رہیں گے)، تو اگلے جنم میں براہمن اور کھشتری بن جائیں گے۔ اس عقیدے کی رُو سے محکوم طبقات کو مطمئن کر دیا گیا کہ یہ سب ان کے اپنے کئے کا پھل ہے۔ ان پر ظلم نہیں ہو رہا۔ نہ ہی وہ اس جنم میں اس تقسیم کو بدل سکتے ہیں۔

اس عقیدہ کا جذبۂ محرکہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس کا نتیجہ جس قدر انسانیت سوز ہے وہ ظاہر ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ اس سے انسان مجبور محض ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ جی میں آئے کر لے، اپنی موجودہ پوزیشن میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا اور معاشرہ ایسے مستقل طبقات میں تقسیم ہو جاتا ہے جنہیں مٹایا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر یہ کہ اس تمام تگ و تاز سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ یہ کہ انسان آواگون کے اس چکر سے نجات حاصل کر لے۔ انسانی تخلیق اور

نظام کائنات کا یہ مقصد کس قدر بے معنی ہے؟

ویدانت کی رُو سے ہندو ویدانت (طریقت یا تصوف) کی رو سے، انسان کی روح (آتما)، خدا (پرماتما) کی روح کا حصہ ہے جو اپنی اصل سے جدا ہو کر، مادی دلدل میں پھنس چکی ہے اور یہاں سے نکلنے کے لئے مصروفِ آہ و فغاں ہے۔ مولانا روم کے الفاظ میں، جو اسی ویدانتی عقیدہ کی صدائے بازگشت ہے،

بشنو از نے چو حکایت می کند
از جدائی ہا شکایت می کند

انسانی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ یہ روح، مادی دلدل سے نجات حاصل کر کے، اپنی اصل سے جا ملے۔ یعنی غالب کے الفاظ میں ـــــ عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ـــــ ترکِ دنیا، سنیاس، اس کا طریقہ ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس عقیدہ کی رو سے، انسانی تگ و تاز کا ماحصل کیا ہے؟ فنا مکمل فنا (Complete Annihilation) یعنی خدا نے انسانی روح کو اپنے سے الگ کر کے، اسے مادی دلدل میں پھنسا دیا۔ اور اس سے کہہ دیا کہ اب تم مشقتیں اٹھاؤ اور مصیبتیں جھیلو تاکہ تم اس دلدل سے نجات حاصل کر سکو۔ آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کی رو سے خود خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار کی پابندی کے لئے جذبۂ محرکہ کیا بنتا ہے؟

یہودیت میں یہودیت میں بھی انسانی زندگی کا منتہیٰ "نجات" ہے لیکن وہاں نجات کا تصور کچھ مختلف ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہودیوں کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل خدا کی چہیتی اولاد ہیں اس لئے وہی جنت کے واحد وارث ہیں۔ جو انسان بنی اسرائیل کے گھر میں پیدا نہیں ہوا، وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اُس زمانہ میں بنی اسرائیل ہی میں ختنے کا رواج تھا اس لئے ان کا عقیدہ تھا کہ مختون سب جنت میں جائیں گے اور غیر مختون جہنم میں۔ چنانچہ تالمود میں ہے۔

> آخرت میں حضرت ابراہیمؑ جہنم کے دروازے پر بیٹھے ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اب رہے ایسے اسرائیلی جنہوں نے سخت گناہ کے کام کئے تھے سو ان کے لئے وہ ایک کام کریں گے۔ وہ اُن بچوں کی ختنہ کی کھال اتار کر جو ختنہ سے پہلے وفات پا چکے تھے، اس قسم کے اسرائیلیوں کے ختنے کے مقام پر چپکا دیں گے اور اس طرح انھیں نامختون بنا کر (چند دنوں کے لئے) جہنم میں بھیج دیں گے۔ (تالمود صفحہ ۴۰۱ - بحوالہ برق طور صفحہ ۱۶۶)

لیکن ان کا جہنم میں داخلہ محض رسم (Formality) پوری کرنے کے لئے ہوگا؛ جہنم کی آگ ان پر کچھ اثر نہیں کرے گی۔ (ایضاً صفحہ ۴۰۵) اس کی وجہ جیوئش انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھی ہے کہ

اسرائیلی گناہگاروں کو جہنم کی آگ چھو نہیں سکے گی۔ اس لئے کہ وہ جہنم کے دروازے پر گناہوں کا اقرار کرلیں گے اور اس طرح خدا کی طرف لوٹ آئیں گے۔ (جلد پنجم صفحہ ۵۸۳)

اُخروی نجات ہی نہیں، بلکہ اس دنیا میں عزت و سرفرازی کے لئے بھی یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ۔

بعض کو عزت ان کے آباء و اجداد کے اعمالِ حسنہ کی بدولت ملتی ہے اور بعض کو ان کی آنے والی نسلوں کے اعمال کے صدقے میں۔

(جیوئش انسائیکلو پیڈیا۔ جلد ششم صفحہ ۶۰)

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے کہ

یہودیوں کی امیدوں کا مرکز ان کے آباء و اجداد کے اعمال ہوتے تھے۔ بالخصوص یہ عقیدہ کہ (حضرت) ابراہیمؑ ہمارے جد امجد ہیں۔

اسی طرح انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجنز اینڈ ایتھکس میں مذکور ہے کہ

یہودیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کے تمام بزرگوں کے اعمال ایک جگہ اکٹھے کرلئے جائیں گے اور انہیں پھر تمام بنی اسرائیل پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک کے حصے میں نجات و سعادت آجائے گی۔ (جلد ۱۱ - صفحہ ۱۴۴)

آپ غور فرمائیے کہ ان عقائد کی موجودگی میں اخلاقی اقدار کی پابندی کا کوئی سوال بھی پیدا ہوتا ہے؟

عیسائیوں میں عیسائیت میں عقیدہ یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، اپنے اولیں ماں باپ (آدم و حوا) کے گناہوں کا بوجھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ انسان سے ان گناہوں کی آلائش کا دور ہو جانا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کے لئے خدا نے انسانوں پر رحم کھایا اور اپنے اکلوتے بیٹے (یسوع مسیحؑ) کو دنیا میں بھیجا کہ وہ صلیب پر جان دے کر ان کے گناہوں کا کفارہ ادا کردے۔ جو لوگ حضرت مسیحؑ کے اس کفارہ پر ایمان لائیں گے، ان کی نجات ہو جائے گی۔ جو ایمان نہیں لائیں گے وہ جہنم میں جائیں گے۔ نجات کے لئے اعمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ سینٹ پال افسیوں کے نام اپنے خط میں لکھتا ہے

تم کو ایمان کے وسیلے ہی سے نجات ملی ہے۔ اور یہ تمہاری طرف سے نہیں خدا کی بخشش ہے۔ اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔ (افسیوں - ۲/۸-۹)

اور رومیوں کے نام خط میں ہے۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان شریعت کے اعمال کے بغیر، ایمان کے سبب سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ (۳/۲۸)

گلیتون کے نام ایک خط میں اس حقیقت کی وضاحت ان الفاظ میں کردی گئی ہے کہ

جتنے لوگ شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جو کوئی ان سب باتوں کے کرنے پر قائم نہیں رہتا جو شریعت کی کتاب میں لکھی ہیں وہ لعنتی ہے۔ اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ راستباز ایمان سے جیتا رہے گا اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں ... مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا (معاذ اللہ) اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑا دیا۔ (گلیتون ۳: ۱۰-۱۴)

آپ سوچئے کہ اس عقیدہ کے بعد اخلاقی اعمال کی کہیں گنجائش بھی رہتی ہے۔ بلکہ اس کی رو سے، جو شخص اعمال پر بھروسہ کرتا ہے وہ "لعنتی" قرار پاتا ہے۔ عیسائیت کے اس عقیدہ کی رو سے، انسان جس مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے وہ اس کے اپنے کسی جرم کا نتیجہ نہیں، بلکہ اس کے اولیں ماں باپ کے گناہوں کی پاداش ہے جس میں یہ بیچارہ مفت میں ماخوذ کر دیا گیا ہے۔ اور پھر اس مصیبت سے چھٹکارا، کسی حسنِ عمل کے نتیجہ میں نہیں ملتا، بلکہ حضرت مسیحؑ کے کفارہ پر ایمان سے ملتا ہے۔ باقی رہا۔ ازلی گناہ "کے عقیدہ کا باطل ہونا، سو اس کے متعلق اب خود عیسائی دنیا کے ارباب فکر و تحقیق، اعلان پر اعلان کر رہے ہیں کہ یہ عقیدہ باطل ہے۔ مثلاً (R. F. JOHNSON) اپنی کتاب (Confucianism and Modern China) میں لکھتا ہے کہ

ازلی گناہ کا عقیدہ درحقیقت "ازلی حماقت" ہے جس کی وجہ سے ہم ہر قسم کے خیر سے بیزار اور ہر قسم کے شر کی طرف مائل رہتے ہیں۔

مسٹر (A. E. TAYLOR) لکھتا ہے۔

یہ عقیدہ ایک بطلان ہے۔ میں کسی ایسے سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والے مذہب کا استقبال کروں گا جو ہمیں فطرتِ انسانی پر ایسی مضحکہ انگیز تہمت پر ایمان رکھنے کی مزدوری سے بچالے۔

(MIND - July 1912)

قرآن کی رُو سے

"یہ سائنٹفک اور خدا کی طرف دعوت دینے والا مذہب" اسلام ہے جس نے اعلان کر دیا کہ کوئی انسان، نہ اپنے سابقہ جنم کے گناہوں کا بوجھ لادے دنیا میں آتا ہے اور نہ اپنے اولیں ماں باپ کی لغزشوں کی آلائش سے ملوث ہوتا ہے۔ دنیا میں ہر انسانی بچہ سادہ لوح (Clean Slate) لے کر آتا ہے اور واجب التکریم پیدا ہوتا ہے۔ اس کے اندر، حیوانی سطح کی طبیعی زندگی سے بلند و بالا زندگی بسر کرنے کی صلاحیتیں بطور امکانات (Realisable possibilities) رکھ دی گئی ہیں ان صلاحیتوں (potentialities) کی نشوونما (Development) انسانی زندگی کا مقصود ہے

اگر انسان صرف اپنی طبیعی زندگی (physical life) کی صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے تو اسے طبیعی دنیا کی آسائشیں اور قوتیں حاصل ہو جاتی ہیں لیکن اسے انسانی سطح کی بلند زندگی نصیب نہیں ہوتی۔ جسے قرآن جنتی زندگی سے تعبیر کرتا ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهُ فِيهَا مَا نَشَاءُ لِمَنْ نُرِيدُ۔ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهُ جَهَنَّمَ يَصْلَاهَا مَذْمُومًا مَدْحُورًا (۱۷/۱۸)، جو صرف دنیاوی زندگی کا مفاد عاجلہ چاہتا ہے، اسے ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق، جسے ہم نے اپنے ارادے سے بنایا ہے، یہ عجلت دیدیتے ہیں۔ لیکن اس کی (انسانی) زندگی جہنم کی زندگی ہوتی ہے جسے وہ ذلت وخواری میں بسر کرتا ہے۔ لیکن جو شخص طبیعی زندگی کے ساتھ، اپنی انسانی زندگی کی نشوونما بھی کرتا ہے اسے طبیعی مفاد بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی ذات میں بھی بالیدگی اور ارتقاء ہوتا چلا جاتا ہے وَمَنْ أَرَادَ الْآخِرَةَ وَسَعَىٰ لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَشْكُورًا (۱۷/۱۹) اور جو مستقبل کی خوشگواریاں چاہتا ہے اور اس کیلئے ایسی کوشش کرتا ہے جیسی کرنی چاہیئے، اور وہ خدا کی متعین کردہ بلند اقدار کی صداقتوں پر ایمان رکھتا ہے، تو اس کی کوششیں بھرپور نتائج کی حامل ہو جاتی ہیں۔ كُلًّا نُمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) ہم اس گروہ کو بھی اپنے قانونِ مشیت کے مطابق، بڑھاتے رہتے ہیں، اور اُس گروہ کو بھی۔ اور ان کی سعی وعمل کے حساب سے انھیں اپنی بخشائشوں سے نوازتے ہیں۔ یاد رکھو! ہم نے اپنی ان نعمتوں پر بند نہیں لگا رکھے کہ کسی قوم کو اس سے آگے نہ بڑھنے دیں اور کسی سے رعایت برت کر اس کے لئے یونہی دروازے کھول دیں[1]۔

ہست ایں میکدہ دعوتِ عام است اینجا
قسمتِ بادہ باندازۂ جام است اینجا

انسانی ذات کی یہ نشوونما اس نظام کے اندر ہو سکتی ہے جو مستقل اقدار کی بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔ یہ نشوونما، اعمال کے فطری نتائج کا نام ہے۔ نیک اعمال وہ جن سے انسانی ذات کو استحکام وبالیدگی ملتی ہے۔ برے وہ جن سے اسے ضعف پہنچتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ، ساتھ کے ساتھ، انسانی ذات پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ یہی اس کا اعمالنامہ ہے جو قرآن کے الفاظ میں، اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے اور جو ظہور نتائج کے وقت کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ جو انسانی ذات

---

[1] قرآن کریم میں اس مضمون کی بے شمار آیات ہیں کہ ایمان واعمال صالح کا فطری نتیجہ، اس دنیا کی خوشگواریاں اور سرفرازیاں اور حیات آخرت کی سربلندیاں اور شادابیاں ہیں۔ جو لوگ زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں انھیں اس دنیا میں آسائشیں حاصل ہو سکتی ہیں لیکن آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ یہ آیات میری کتاب "نظام ربوبیت" میں بہ تفصیل ملیں گی۔ اس مقام پر انھیں درج نہیں کیا جاتا۔

ایک خاص معیار کے مطابق نشو و نما پائے گی وہ زندگی کے اگلے ارتقائی مراحل طے کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اسے جنت اُخروی کی زندگی کہتے ہیں۔ جو اس معیار پر پوری نہیں اترے گی اس کی نشو و نما رک جائے گی — یہ جہنم کی زندگی ہے۔ — اسی کو قرآن نے پلڑے کے بھاری اور ہلکا ہونے سے تعبیر کیا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۔ وَ اَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۔ (۱۰۱/۶-۹) سو جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ مسرتوں کا جھولا جھولے گا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا، وہ تباہی کے گڑھے میں جا گرے گا۔

آپ نے دیکھا کہ قرآن کی رُو سے، مقصد زندگی کسی مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں، بلکہ اپنی مضمر صلاحیتوں کی مناسب نشو و نما سے، ایک بلند مقام حاصل کرنا، اور موجودہ زندگی سے اعلیٰ و ارفع سطح زندگی پر پہنچ جانا ہے۔ اسے قرآن نے فوز اور فلاح کی اصطلاحات سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی (Achievement) اور (Success) نہ کہ نجات (salvation)۔ اس سے آپ نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ اس تصور کے ماتحت اس سوال کا جواب کس حسن و خوبی سے مل جاتا ہے کہ میں اخلاقی اقدار کی پابندی کیوں کروں۔ اس سے میرا کیا فائدہ ہوگا اور ایسا نہ کرنے سے کیا نقصان۔ یہی وہ طریق ہے جس سے انسان ان اقدار کی پابندی علیٰ وجہ البصیرت (Rationally) کرتا اور قلب و دماغ کے پورے اطمینان سے ان پر کاربند رہتا ہے۔

الدّین تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کریم چند اخلاقی اقدار ہی نہیں دیتا بلکہ زندگی کا ایک ہمہ گیر نظام عطا کرتا ہے جو خدا، انسان۔ کائنات۔ قانون مکافات۔ اور مقصد و مآل زندگی کے بنیادی تصورات پر استوار ہوتا ہے۔ اس پورے نظام کا نام الدین ہے اور اس کی عملی شکل کو الاسلام کہا گیا ہے۔ اخلاقی اقدار اسی نظام کے اندر نتیجہ خیز ہوتی ہیں اور علیٰ وجہ البصیرت ممکن العمل بھی۔ اس نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام ایسا نہیں جس میں یہ مقاصد حاصل ہو سکیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (۳/۱۸)

یہ حقیقت ہے کہ الدین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے

اس لئے مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۳/۸۵) جو شخص اسلام کے علاوہ کوئی اور نظام زندگی اختیار کرنا چاہے گا تو اس سے اس نظام کو قبول نہیں کیا جائیگا اور وہ دیکھ لے گا کہ آخرالامر وہ کس قدر نقصان میں رہتا ہے۔

اسے بالکلیہ اختیار کیا جائے گا نظام کے تصور سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ اس کے مختلف اجزا کے نتائج اسی صورت میں مرتب ہو سکتے ہیں جب اس نظام کو بالکلیہ اختیار

کیا جائے۔ نظام کی مثال، طبیب کے نسخے کی سی ہوتی ہے۔ نسخے کا فائدہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب آپ اسے پورے کا پورا، متعلقہ ہدایات کے مطابق استعمال کریں۔ اگر آپ اس نسخے میں سے ایک دو دوائیاں لے کر انھیں استعمال کرنا شروع کر دیں تو وہ آپ کو کچھ بھی فائدہ نہیں دیں گی۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ نقصان ہی دیدیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ ..... (۲/۸۵)

"کیا تم اس ضابطہ قوانین کے ایک حصہ کو ماننا چاہتے ہو اور ایک حصے سے انکار کرنا چاہتے ہو؟ جو شخص تم میں سے ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو گا کہ اس کے لئے اس دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی ہو۔ اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں" اس نسخہ کے اجزائے ترکیبی، وہ تمام صفاتِ خداوندی ہیں جنہیں قرآن الاسماء الحسنیٰ کہہ کر پکارتا ہے۔ ان میں سے بعض اجزاء کو لے لینا اور دوسرے اجزاء کو چھوڑ دینا، کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے۔ حقیقت (REALITY) ایک ناقابل تقسیم وحدت (INDIVISIBLE WHOLE) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کئے جا سکتے۔ خدا کے الاسماء الحسنیٰ حقیقتِ مطلق کے مختلف پہلو (Facets) ہیں۔ حقیقت ان تمام کے مجموعے کا نام ہے۔ ان میں سے بعض کو الگ کر لیا جائے تو وہ اس حقیقت کے اجزا نہیں قرار پا سکتے۔ مثلاً اگر حقیقت کے سو گوشے ہیں اور ان میں سے آپ دس گوشے الگ کر لیتے ہیں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ نے حقیقت کے ۱/۱۰ حصہ کو اختیار کر لیا ہے، اس لئے آپ کو اسی تناسب سے وہ فائدہ ہو جائے گا جو پوری حقیقت کے اختیار کرنے سے ہوتا۔ آپ نسخے کی دس دوائیوں میں سے ایک دوائی کھا کر دسواں حصہ شفا حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ

وَ لِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۔ وَ ذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۔ (۷/۱۸۰)

"اور اللہ کے لئے الاسماء الحسنیٰ ہیں (وہ اس حقیقت کلی کے مختلف گوشے ہیں) سو اسے ان تمام گوشوں کے ساتھ پکارو۔ اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے ان اسماء (صفات) میں سے (بعض کو لے کر) ایک طرف نکل جاتے ہیں۔" آپ دیکھیں گے کہ جو لوگ اسلامی نظامِ زندگی سے الگ رہتے ہیں ان کے ہاں جن اخلاقی اقدار پر عام طور پر زور دیا جاتا ہے وہ وہی ہوتی ہیں جن کا تعلق انسان کے نرم و نازک جذبات سے ہوتا ہے۔ ہمدردی۔ رحم۔ عفو۔ درگذری منکسر المزاجی۔ نرم خوئی۔ کوئی دس گالیاں بھی دے جائے تو خاموش رہو۔ جو ایک گال طمانچہ مارے، اس کے

سامنے دوسرا گال بھی کر دو۔ جو تمہارا کوٹ اتارنے اسے صدری اتار کر خود دے دو۔ دشمن سے بھی پیار کرو۔ یا ذرا آگے بڑھو تو چڑیوں، کوّوں کو دانہ ڈالو۔ مویشیوں کے لئے پیاؤ بنا دو۔ وغیرہ وغیرہ۔ عدل، ظلم کی روک تھام، سلب و نہب (EXPLOITATION) کا انسداد۔ عالمگیر انسانیت کے حقوق کا تحفظ۔ ایسا سیاسی نظام جس میں کوئی کسی کا محکوم نہ ہو۔ ایسا معاشرتی نظم و نسق جس کی بنیاد احترام آدمیت پر ہو۔ ایسا معاشی دستور جس میں کوئی کسی کا محتاج نہ ہو اور ہر ایک کی ضروریات زندگی بلا مشقت و ذلت پوری ہوتی رہیں۔ ایسا عمرانی آئین جس کی رُو سے ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ پیدا کرتا چلا جائے۔ ان باتوں کی ان کے ہاں کوئی اخلاقی اہمیت نہیں ہوگی۔ عیسائیت جو مذکورہ بالا قسم کی اخلاقی اقدار کی سب سے بڑی علمبردار

عیسائیت کی تعلیم کا نتیجہ

ہے، اس کے متعلق، ہسپانیہ کے نامور پروفیسر (Dr. FALTA De CRACIA) کے الفاظ میں سنئے جنہیں برفو (BRIFAULT) نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب (The Making of Humanity) میں نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے:۔

عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس طرح ذہنی دیانت کا۔ یہ اس کے تصور اخلاق سے یکسر باہر کی شے ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت و ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں۔ لیکن خود ظلم و ستم سے ہمیشہ تسامح برتا ہے۔ اس نے ان لوگوں کو جو ظلم و استبداد کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے ہوں، جنہیں مصائب و شدائد کے ہجوم نے گھیر رکھا ہو، دعوت دی ہے۔ اور انہیں آئین محبت کی تعلیم دی ہے۔ انہیں، رحم و عفو کا سبق سکھایا ہے۔ انہیں خدا کی ربوبیت کی یاد دلائی ہے۔ لیکن مذہب و اخلاق کے اس طوفان میں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ، وہ اخلاقی ضوابط کی معراج کبریٰ ہے، عام انصاف اور عام دیانت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ مسیح مقدس۔ جو رو استبداد کے ستائے ہوئے مظلوم انسانوں کے درمیان، آسمان سے اُترتا ہوا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو اُن کی طرف فارقلیط کا پیغام رحمت و شفقت پہنچاتا ہے۔ لیکن اس جور و استبداد کی علت معلوم کرنا اس کے دائرۂ شعور سے باہر ہے۔ خیر و شر کا صحیح تصور اس کے حیطۂ نگاہ سے خارج ہے۔ یہ ظلم و ستم اس کے نزدیک خدا کی طرف سے گناہگاروں کے لئے ابتلاء و آزمائش ہے۔ نظام عالم کا خاصہ ہے۔ اس حکومت کا فیصلہ ہے جو دنیا میں خدائی حقوق کی بنا پر قائم ہے۔ سینٹ ونسنٹ فرانس کے اس قید خانہ کا معاینہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیام عام کرتا ہے۔ اور گناہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے، اس کا اسے احساس تک بھی نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں، انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی

زنجیروں میں جکڑے رہیں، ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں۔ فنا ہو جائیں، عیسائیت کی روح انھیں جا کر تسلی دے گی۔ لیکن یہ اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح سے مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان چیزوں کا اسے احساس ہی نہ ہوگا۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ عدل و انصاف اور حق و باطل کی طرف سے عیسائیت کی روح یکسر بے حس ہے۔ یہ تصور اس کے نزدیک ایسا ہی اجنبی ہے جیسا صداقت کا تصور، وہ ہمیشہ عفو، برداشت، رحمدلی کا سبق پڑھاتی رہی۔ لیکن عدل و انصاف کی اسے کبھی یاد تک نہ آئی۔ زندگی اور اس کی تمام خود داریوں کا ترک ۔۔۔ قدسیۂ آرزو ۔۔۔ عدم مدافعت، مخلوش اطاعت، ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا سامنے کر دینا، غرضیکہ اس قسم کے متشدد (غیر فطری) ضابطۂ اخلاق کا طوفان، عیسائیت کے شعور کو مشتعل کر سکتا تھا۔ لیکن ظلم و استبداد اور جور و ستم کے کسی منظر سے وہ متاثر نہیں ہو سکتی تھی۔ (The Making of Humanity pp. 332-333)

لامذہبوں کی حالت

یہ تو رہی مذہب پرست طبقہ کی اخلاقی اقدار کی کیفیت۔ اب ان لوگوں کو لیجئے جو نہ خدا کو مانتے ہیں، نہ انسانی ذات کی بقا کو۔ نہ وحی کے قائل ہیں نہ حیات آخرت کے۔ اور اس کے باوجود اخلاقی اقدار کی تلقین کرتے ہیں۔ ان میں سے کسی سے پوچھئے کہ آپ جو کہتے ہیں کہ (مثلاً) غریب کی مدد کرنی چاہیئے، تو مجھے سمجھائیے کہ میں غریب کی مدد کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ ان کی طرف سے اس کے عجیب و غریب قسم کے جوابات ملیں گے۔ کوئی کہے گا کہ یہ انسانی فریضہ ہے کہ ہم غریب کی مدد کریں۔ ان سے پوچھئے کہ صاحب! انسانی فریضہ کا مطلب کیا ہے، اور وہ کون ہے جس نے مجھ پر یہ فریضہ عائد کر رکھا ہے؟ آپ دیکھیں گے کہ اس کا ان کے پاس کوئی معقول جواب نہیں ہوگا۔ کوئی کہے گا کہ ہمیں غریب کی مدد اس لئے کرنی چاہیئے کہ اگر ہم کل کو غریب ہو گئے تو دوسرا ہماری مدد بھی کرے۔ اول تو یہ معاوضہ (Reciprocity) کا جذبہ اس قدر پست ہے کہ اسے آپ کبھی بھی بلندیٔ کردار سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ جو لوگ یہ انتظام کر لیں کہ انھیں کسی کی مدد کی کبھی ضرورت نہ پڑے، انھیں آپ غریبوں کی مدد کے لئے کس طرح آمادہ کر سکیں گے آپ دیکھیں گے کہ ان کی اپیل یکسر جذبات سے ہوگی۔ دلیل و برہان کی رُو سے وہ کوئی معقول جواب نہیں دے سکیں گے اور یا، ذرا گہرائی میں جا کر دیکھئے تو ان کے تحت الشعور میں، یہ جذبات کروٹیں لے رہے ہوں گے کہ ان باتوں کو معاشرہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس لئے معاشرہ میں عزت حاصل کرنے کے لئے یہ کچھ کرنا چاہیئے۔ اور یا اس کے پیچھے سیاسی محرکات کارفرما ہوں گے۔ جیسے مشنریوں کے ہسپتال اور اسکول کالجز۔ یا جیسا گاندھی (آنجہانی) کی اہمسا۔ یا یہ نتیجہ ہوگا بدائتی اور وراثتی عقائد کا اور یا انسان کے کمزور اعصاب کا جن کا نام نیک جذبات رکھ لیا جاتا ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی انسانی کردار کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ باقی رہا نیشنل کیریکٹر، سو اس کے متعلق شروع میں عرض کیا جا چکا ہے۔ جذبات کے زور پر آپ کسی سے ہنگامی طور پر تو کوئی اچھا کام کرا سکتے ہیں۔ لیکن اس اچھے کام کو اس کی زندگی کا معمول نہیں بنا سکتے۔ اس میں ثبات و دوام نہیں پیدا کر سکتے۔ اور کیریکٹر کہتے ہی اس نہج زندگی اور اسلوب حیات کو ہیں جس میں ثبات و دوام ہو۔ اس ثبات و دوام کا ضامن صحیح تصور حیات پر ایمان کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ قرآن ان لوگوں کو بھی جو کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں اور انھیں بھی جو کسی مذہب کو نہیں مانتے، زندگی کے ان تصورات پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہے جو اس کے نظام کی اصل و بنیاد ہیں وہ ان کے متعلق کہتا ہے کہ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

اگر یہ لوگ ان تصورات پر اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو پھر یہ زندگی کی صحیح شاہراہ پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ ایسا نہ کریں، تو پھر سمجھ لو کہ یہ صداقت و حقیقت کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اس راہ پر چل نہیں رہے۔

یہ ہیں برادرانِ عزیز اسلام کی وہ خصوصیات جو نہ عالم مذاہب میں کہیں مل سکتی ہیں اور نہ ہی دنیائے فکر میں۔ اس لئے دین الحق اس کے سوا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔

مسلمانوں کو انتباہ

اس مقام پر میں ایک انتباہ ضروری سمجھتا ہوں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم یہ کہہ کر کہ ہمارا دین تمام مذاہب سے افضل ہے، خوش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ اس سے ہم بھی دنیا میں سب سے افضل قرار پا جاتے ہیں اور اگر دنیا میں ہماری حالت اچھی نہیں تو اس کی چنداں پرواہ نہیں۔ اس لئے کہ دنیا چند روزہ ہے اس کے بعد عاقبت میں جنت کے وارث ہمیں ہوں گے۔ باقی سب جہنم میں جائیں گے

یہ بہت بڑی خود فریبی ہے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ (قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی کچھ یہودی بھی کہا کرتے تھے۔ اس سے ان کی جو حالت ہوئی وہ دنیا پر روشن ہے)۔ اسلام کا افضل ہونا ہمیں اس صورت میں فائدہ دے سکتا ہے کہ ہم اس کے مطابق عمل کر کے خود افضل بن کر دکھائیں۔ خود ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا اور اسلام کی افضلیت پر ناز کرتے رہنا، حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص دنیا بھر میں ڈھول پیٹتا پھرے کہ ہمارے ہاں ایک خاندانی نسخہ ہے جو اکسیر حیات ہے اور تمام بیماریوں کا مجرب علاج۔ اور خود اپنے سر درد کے لئے بھی دوسروں سے دوائی مانگتا پھرے۔ کہیئے کہ ایسے شخص کو وہ نسخہ کیا فائدہ دے سکتا ہے اور اس کا اس پر فخر کرنا اس کے کس کام آ سکتا ہے؟

عمل سے زندگی بنتی ہے

اس سے تو اس کی اُلٹی جگ ہنسائی ہوگی۔ اور کوئی شخص اس کے دعوے کو صحیح تسلیم نہیں کرے گا۔ سنجے کے مجرب ہونے کا اولین اور بنیادی ثبوت خود اس خاندان کی اپنی صحت ہوگی۔ اسلام نے اپنی صداقت اور فوقیت کا یہی ثبوت پیش کیا تھا۔ جب نبی اکرمؐ نے اس دین کے مخالفین سے کہا تھا کہ

يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)

تم اپنے نظام کے مطابق کام کرتے جاؤ۔ میں اپنے نظام کے مطابق کام کرتا ہوں۔ عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اس گھر کی کامیابی آخر الامر کس کے حصے میں آتی ہے۔ اس طرح میرا یہ دعویٰ سچ بن کر سامنے آجائے گا کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی اور ایسا کہنے والے نے سب سے پہلے خود اپنے آپ کو اپنے دعوے کی صداقت میں بطور شہادت پیش کر دیا۔ جب حضورؐ کے مخالفین نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ آپ اپنے دعوے میں سچے ہیں تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۱۰/۱۶)

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر اپنی عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے نہیں سمجھ سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

یاد رکھئے! عزیزانِ من۔ دنیا میں اسلام کو بطور ایک سچے دین کے وہی شخص پیش کر سکتا ہے جو دوستوں کی محفل میں نہیں بلکہ دشمنوں کے بھرے مجمع میں، اپنی زندگی کو اپنی صداقت کی شہادت میں پیش کر سکے اور پھر اس کے خلاف کسی کو اُنگلی اُٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ یہی اسلام کی تبلیغ کا صحیح طریقہ ہے۔

اب آخر میں، میں دو ایک ایسے شکوک کا ازالہ ضروری سمجھتا ہوں جو اس ضمن میں اکثر دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ قرآن کریم دیگر اہل مذاہب سے کہتا ہے کہ میں مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ ہوں۔ یعنی جو تعلیم تمہارے پاس ہے میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ سو جب قرآن کریم خود ان مذاہب کی تعلیم کو سچا تسلیم کرتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے سچی تعلیم صرف قرآن کریم کے اندر ہے، دیگر اہل مذاہب کے پاس نہیں۔

مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ

اعتراض واقعی وزنی ہے اور اس کا جواب نہایت ضروری۔ سب سے پہلے آپ یہ دیکھئے کہ کیا یہ مطالبہ کہ دیگر اہل مذاہب اس پر ایمان لائیں قرآن کریم کا مطالبہ ہے یا یہ مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے؟ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ والے ٹکڑے کی پوری آیت یوں ہے۔ یہود سے کہا جاتا ہے کہ

وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ (۲/۴۱)

"تم اس کتاب، پر ایمان لاؤ جو میں نے (اب) نازل کی ہے (یعنی قرآن پر) جو مصدق ہے اس کا جو تمہارے پاس ہے۔ اور سب سے پہلے تم ہی اس کے منکر نہ بنو!" اس سے ظاہر ہے کہ قرآن خود اہلِ مذاہب سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لائیں۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ تصریح موجود ہے کہ ان اہلِ مذاہب نے اپنی اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی تھی۔ لفظی تحریف بھی (۴۶/۴) اور معنوی بھی (۱۳/۵) اس میں اپنی طرف سے اضافے بھی کر دیئے تھے (۷۹/۲) اور حق کو باطل کے ساتھ مخلوط بھی کر دیا تھا (۴۲/۲)۔ اس طرح ان کتابوں میں بے شمار اختلافات پیدا ہو چکے تھے۔ (۱۱۳/۲) قرآن کے ان دعاوی کی شہادت خود یہ اہلِ مذاہب دیتے ہیں۔ چنانچہ کوئی غیر مسلم بھی آج اس کا بدلائل دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جس کتاب کو وہ اپنی آسمانی کتاب کہہ کر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں وہی ہے جو ان کے پیغمبر پر نازل ہوئی تھی۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کو میری کتاب، معراج انسانیت، کے باب اوّل میں ملے گی جس میں تمام مذاہب عالم کی مبینہ آسمانی کتابوں کی تاریخ خود ان مذاہب کے متبعین کی تحقیق کے مطابق بیان کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جن کتابوں کو خود ان کے متبعین بھی حقیقی اور غیر محرف نہیں کہتے قرآن کریم ان کی صداقت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے۔

ان کتابوں میں، اس قدر تحریف و الحاق کے باوجود، کچھ اخلاقی اقدار موجود ہیں۔ قرآن کریم اپنی اقدار کی تصدیق کرتا ہے، نہ کہ پوری کی پوری کتابوں کی۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مصدق کے معنی "تصدیق کرنے والا" نہیں۔ اس کے معنی ہیں "سچ کر کے دکھانے والا"۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ تمہارے پاس جو اخلاقی اقدار ہیں، وہ محض نظری حیثیت سے ہیں۔ میں وہ نظام دیتا ہوں جس میں یہ اقدار، عملی حقیقتیں بن کر سامنے آجائیں۔ اور یہی میری خصوصیت ہے۔ مثلاً تم بھی یہ کہتے ہو کہ بھوکے کو روٹی کھلانی چاہیئے، اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ تم اسے محض وعظ و نصیحت کے طور پر کہتے ہو اور لوگوں کو خیرات دینے کی تلقین کرتے ہو۔ اس سے جس طرح لوگوں کی بھوک کا علاج ہوتا ہے، اسے ہر شخص جانتا ہے ؛ میں ایک ایسا عملی نظامِ معیشت عطا کرتا ہوں جس میں کوئی فرد بھوکا نہیں رہ سکتا۔ اس طرح میں، اس اخلاقی قدر کو سچ کر کے دکھا دیتا ہوں۔

اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے عملی نظام کی رُو سے، یہ تمام اخلاقی قدریں سچ بن کر سامنے آجاتی ہیں۔ یہ چیز دین میں ممکن ہے۔ مذہب میں نہیں۔ اس لئے اسلام کو الدین کہا گیا ہے، مذہب نہیں کہا گیا۔ اس کا مقابلہ بھی دنیا کے دوسرے نظامہائے زندگی سے کرنا چاہیئے، مذاہب سے نہیں۔

دوسرا شبہ

دوسرا سوال یہ اٹھایا جاتا ہے کہ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن تک اسلام پہنچا ہی نہیں، یا (مثلاً) ایک شخص ہندوؤں کے گھر پیدا ہوتا ہے اور نہایت دیانتداری سے اپنے دھرم

سچا سمجھ کر اس پر کاربند رہتا ہے۔ ایسے لوگوں کا کیا قصور ہے کہ ان پر فلاح و فوز کے دروازے بند کر دیئے جائیں یہ سوال بھی بہت سے قلوب کو طلسم پیچ و تاب بنائے رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

اگر نجات و سعادت یا جزا سزا کا معاملہ محض جذباتی ہوتا تو واقعی یہ بات قابلِ تسلیم ہوتی کہ جن لوگوں کا کچھ قصور نہیں انہیں سزا کیوں دی جائے۔ لیکن جب جزا سزا کا تعلق قانون سے ہو اور فوز و فلاح اعمال کے فطری نتائج کا نام تو اس میں جذبات کا دخل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جس گاؤں میں مدرسہ نہیں اس کے بچے ان پڑھ رہ جائیں گے اور جو فوائد پڑھے لکھے لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں وہ ان سب سے محروم رہیں گے۔ یہ بہت بڑی سزا ہے جو ان بچوں کو مل رہی ہے۔ حالانکہ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں آپ ان سے کتنی ہمدردی کیوں نہ کریں، علم سے بہرہ رہنے سے جو کمی ان میں آگئی ہے آپ کی ہمدردیاں اور رقیق جذبات اس کمی کو دور نہیں کر سکتے۔ یہاں یہ سوال ہی نہیں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟ جو بچہ بیماری کی وجہ سے سال بھر اسکول نہ جا سکے، آپ اسے اس بنا پر اگلی جماعت میں نہیں چڑھا دیتے کہ اس میں اس کا کیا قصور ہے! اگلی جماعت میں اسے ہی چڑھایا جائے گا جس میں اس جماعت میں چلنے کی استعداد پیدا ہو چکی ہوگی۔ قرآن کی رو سے، زندگی کے اگلے مراحل میں وہی پہنچ سکے گا جس میں ان مراحل کے طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ہوگی۔

اسی اصول کا ان لوگوں پر بھی اطلاق ہوگا جو نہایت نیک نیتی سے غلط کو صحیح سمجھ کر اس پر کاربند رہتے ہیں۔ جو شخص نہایت نیک نیتی سے سنکھیا کو دوائی سمجھ کر کھا لیتا ہے، سنکھیا یہ کہہ کر اپنا مضر اثر نہیں روک لے گا۔ کہ کھانے والے نے اسے نہایت نیک نیتی سے دوائی سمجھ کر کھایا تھا۔ سنکھیا اپنا اثر یکساں کرے گا۔ خواہ کسی نے اسے دیدہ و دانستہ کھایا ہو یا غلطی سے۔ جو قوم آگ اور پانی (اگنی اور اندر) کو دیوتا سمجھ کر ان کی پرستش کرتی رہے، وہ بھاپ کو اپنے کنٹرول میں لا کر انجن نہیں چلا سکتی۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم ان تمام فوائد سے محروم رہے گی جو بھاپ (STEAM) کی قوت (POWER) سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان کی یہ محرومی، کسی کی طرف سے ملی ہوئی انتقامی سزا نہیں۔ ان کی جہالت کا فطری نتیجہ ہے جسے ہمدردی کے کوئی جذبات دور نہیں کر سکتے۔ یہ اسی صورت میں دور ہو سکتی ہے کہ وہ قوم قوانینِ خداوندی کی طرف رجوع کرے اور فطرت کی ان قوتوں کو مسخر کر کے ان سے اپنے فائدے کے کام لے۔ قرآن کی رو سے، فلاح و فوز کے لئے یہی قانون مقرر ہے۔ اس میں نہ کسی کی آرزوؤں کا دخل ہے نہ جذبات کا تعلق۔ اس کا واضح اعلان ہے کہ

لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ ۗ مَنْ يَعْمَلْ سُوءًا يُجْزَ بِهِ (۴/۱۲۳)

فیصلہ نہ تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی اہلِ کتاب کی آرزوؤں کے مطابق۔ فیصلہ ہمارے قانون کے

مطابق ہوگا اور وہ قانون یہ ہے کہ جو بھی غلط کام کرے گا، وہ اس کا نتیجہ بھگتے گا۔

اور قانون کو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ اگر قانون لوگوں کے جذبات کے تابع چلنے لگے تو سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جائے

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَاءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ وَمَن فِيهِنَّ (۲۳/۷۱)

اگر حق لوگوں کی خواہشات کے تابع چلنے لگے تو ارض و سموات اور جو کچھ ان کے اندر ہے، سب تہس نہس ہو جائے۔ خدا ہی وہ سکتا ہے، جو جذبات سے بلند ہو۔ اسی لئے، جو قومیں اپنے جرائم کے نتیجہ میں تباہ و برباد ہوتی ہیں، ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُم بِذَنبِهِمْ فَسَوَّاهَا ۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبَاهَا (۹۱/۱۴-۱۵) ان کے رب نے ان پر (قانونِ مکافات کا) (Road - Roller) بھیج دیا جس نے انہیں زمین کے ساتھ ہموار کر دیا اور ان کے انجام کے خیال سے خدا کے دل میں کوئی خوف اور ڈر پیدا نہ ہوا۔ وہ اس پر قطعاً لرزاں و ترساں نہ ہوا۔ حتیٰ کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ (۴۴/۲۹) نہ ان پر آسمان رویا اور نہ زمین۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ اس کے قانون میں توبہ اور بازآفرینی کی گنجائش ہی نہیں۔ جس سے کوئی ایک جرم سرزد ہو گیا وہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو گیا۔ نہیں! اس کے ہاں احساسِ ندامت کے بعد، اصلاح کا ہر وقت موقع ہوتا ہے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ ۔
إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۔ (۳۹/۵۳)

"ان سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو وہ تمہاری تمام لغزشوں کے مضر اثرات سے تمہاری حفاظت کر دے گا۔" اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم ایسے اچھے کام کرو جن سے اس نقصان کی تلافی ہو جائے جو غلط روی سے تمہیں پہنچا ہے۔ اس لئے کہ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (۱۱/۱۱۴)۔ ناہمواریوں کے مضر اثرات کو حسن کارانہ زندگی کے اعمال ہی مٹا سکتے ہیں۔

اب رہی آخری بات کہ جن لوگوں تک اسلام کا پیغام نہیں پہنچ سکا تو اس کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر ہے جو اس کتاب کی وراثت کے مدعی ہیں۔ ہم اگر

ہماری ذمہ داری

اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر رہتے ہیں تو ان لوگوں کی غلط روی کا بار، جن تک ہم نے اسلام نہیں پہنچایا، ہماری گردن پر ہے۔ اسی کے لئے تو قرآن نے کہا ہے کہ وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ ۔ (۲۹/۱۳)۔ وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور ان کے ساتھ دوسرے بوجھ بھی۔ اس وقت

اقوامِ عالم، حق و صداقت کا نظام سامنے نہ ہونے کی وجہ سے، جس قدر انسانیت سوز جرائم کی مرتکب ہو رہی ہیں، ان کے عذاب کا ایک حصہ خود ہماری گردن پر بھی ہے۔ اور یہ چیز ہماری حالت سے عیاں ہے۔ خدا نے ہمیں "شھداء علی الناس" بنایا تھا۔ یعنی تمام اقوامِ عالم کی نگرانی کا فریضہ ہمیں سونپا تھا۔ ہم، دوسروں کی نگرانی تو کجا، خود اپنی نگرانی کے بھی قابل نہ رہے۔ سو اس کا خمیازہ اٹھا رہے ہیں۔ جب کہیں چوری ہو، تو سو جانے والا چوکیدار سب سے پہلے دھر لیا جاتا ہے۔ سو ہم اس غفلت کی سزا بھگت رہے ہیں اور ہمارا یہ دعوٰے کہ اسلام تمام ادیان پر فوقیت رکھتا ہے، ہمیں اس عذاب سے قطعاً نہیں بچا رہا۔ نہ ہی بچائے گا۔ جب تک ہم اس پر عمل کر کے خود اپنے آپ کو اس فوقیت کا مستحق نہ بنا لیں۔

آخر میں، میں اس امر کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اس تقریر میں کہا ہے اُس سے نہ کسی اہلِ مذہب کی دل آزاری مقصود ہے اور نہ ہی ان کے بانیانِ مذاہب میں سے کسی کی (معاذ اللہ) تحقیر مطلوب۔ جہاں تک غیر مذاہب کے بانیوں کا تعلق ہے، قرآن کی رو سے ہمارا ایمان ہے کہ خدا نے دنیا کی تمام اقوام کی طرف اپنے رسول بھیجے تھے۔ ان میں سے بعض کے اسمائے گرامی کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور باقیوں کا نام لیکر ان کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن کسی کا نام قرآن میں آیا ہے یا نہیں، ہم ان تمام فرستادگانِ خداوندی کا دلی ادب و احترام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی رسالت کا اقرار، ہمارا جزوِ ایمان ہے۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ ان حضرات کی طرف سے تو خدا کی سچی تعلیم پیش ہوئی تھی لیکن بعد میں اس تعلیم میں کمی بیشی ہو گئی۔ اور اب وہ اصلی اور حقیقی تعلیم قرآن کریم کے اندر ہے۔ جب ہم اس حقیقت کو پیش کریں گے کہ اب اسلام ہی خدا کا سچا دین ہے، تو اُس کی تعلیم کے سامنے لامحالہ دوسرے مذاہب کی وہ تعلیم لانی پڑے گی جو قرآن کے خلاف ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک سچی نہیں ہو سکتی۔ میں نے غیر مذاہب کی تعلیم کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ صرف اس مقصد کے پیشِ نظر کہا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ اسلام کسی کو بُرا کہہ کر اپنے آپ کو اچھا ثابت نہیں کرنا چاہتا وہ اپنی اچھائی کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا اور دلائل و براہین سے منواتا ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے کہ تم مشرکین کے بتوں کو بھی گالی نہ دو۔ وہ تمام دنیا کی واجب الاحترام ہستیوں کا احترام سکھاتا ہے البتہ ان کی یا ان کی طرف منسوب کردہ، غلط تعلیم کو غلط قرار دیتا ہے۔ یہی شعار ہمارا بھی ہونا چاہیئے۔

والسلام

ایک اور طاہرہ بیٹی کا خط

ہمارے مشفق باپ! ایک اور بیٹی کا درد بھرا سلام لیجئے۔

میں، سب سے پہلے، زاہدہ بہن کے الفاظ میں، طلوعِ اسلام کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ "جس نے ہم بے زبانوں کو زبان دی"۔ حالانکہ ہماری جھکی ہوئی خاموش نگاہیں ایک مدت سے، ہر قلب درد آگیں سے رہ رہ کر کہہ رہی تھیں کہ:-

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

آپ نے "مدعا پوچھنے" کی طرح ڈالی۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اس کے جواب میں آپ کی طاہرہ بیٹیوں نے جس درد و کرب سے اظہارِ مدعا کیا، طلوعِ اسلام میں شائع شدہ تین خطوط اور کنونشن میں بزمِ خواتین کی روئیداد اور تقریریں، اس کی زندہ شہادت ہیں۔ اس سے پیشتر دیکھا یہ گیا تھا کہ اس "بے زبان" کو جب زبان کھولنے کی اجازت ملتی تھی تو یہ جذبۂ انتقام میں بدلگام ہو جاتی تھی۔ لیکن آپ کی قرآنی تعلیم کا یہ اثر ہے کہ اس قدر شدتِ احساس کے باوجود، ہماری بہنوں کی یہ تقریریں قرآنی حدود و قیود سے کہیں باہر نہیں ہونے پائیں۔ میں جوں جوں ان تقاریر کو پڑھتی تھی، وہ شعر بار بار زبان پر آتا تھا جسے آپ سے اکثر سنا ہے کہ۔

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ
جبر ہے دل، پہ اختیار کے ساتھ

اختیار کے ساتھ اس قدر جبر رکھنا ـــــ کارِ ہر دیوانہ نیست ـــــ یہ صرف قرآن کا اعجاز ہے۔ میری ان بہنوں تک، ان کی اس دور افتادہ بہن کا سلامِ محبت اور مبارکباد کا تحفہ پہنچا دیجئے۔ یہ اَن دیکھے رشتے بھی کتنے پیارے ہوتے ہیں!

جن بہنوں کے خطوط طلوعِ اسلام میں شائع ہوئے ہیں، انھوں نے اس استبداد کا تو بار بار ذکر کیا ہے، جو مرد، عورت پر روا رکھتا یا رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے اُس رقابت کی آگ کا ذکر نہیں کیا جو ایک عورت کے سینے میں خود اپنی ہم جنس کے خلاف بھڑکتی ہے ـــــ اس سے میری مراد سوکن نہیں، سوکن کا جلاپا قابلِ فہم ہے۔

اس سے میری مراد، وہ "مشفق ہستی" ہے جو برسوں کی منتوں سماجتوں کے بعد، ہزار چاؤ چونچلوں سے بہو کو بیاہ کر لاتی ہے وہ گھر میں قدم رکھتی ہے تو اُس پر سے پانی نچھاور کر کے پیتی ہے۔ اسے ہر بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے صدقہ اور خیرات بانٹتی ہے۔ ہمجولیوں اور رشتہ داروں کی سو سو مبارکیں لیتی ہے۔ بیٹے پر احسان رکھتی ہے کہ اُسے اس قسم کی بیوی لا کر دی ہے جس کی مثال چراغ لے کر ڈھونڈھے سے بھی نہیں مل سکتی ——— لیکن ابھی اس بے مثال بہو کے ہاتھوں کی مہندی بھی مسلی نہیں ہونے پاتی کہ اُسے اِس میں ہزار کیڑے نظر آنے لگ جاتے ہیں اور وہ اس کی جان کی بیرن بن جاتی ہے۔ ——— کس جرم میں؟ اس کا علم نہ آج تک کسی کو ہوا ہے، نہ اس کے بعد کبھی ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اماں حوا سے جو لغزش ہوئی تھی، اس کی سزا دینے کے لئے، اللہ میاں نے، حوّا کی بیٹیوں پر ایک بلا مسلط کر دی جسے دنیا "ساس" کہہ کر پکارتی ہے۔

میں نے ایم۔ اے کیا تھا اور ٹریننگ کالج میں داخلہ کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک "صدقے واری" جانے والی نے ہمارے گھر کے پھیرے شروع کر دیئے، ہمدرد اور بہی خواہ رشتہ دار، معلوم کون کون سے کونوں کھدروں سے نکل کر سیلاب کی طرح امنڈ آئے۔

> "ایسا رشتہ کہیں نہیں ملے گا۔ لڑکا تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار، صوم وصلوٰۃ کا پابند، بڑا شرمیلا۔ جب دیکھئے نظریں نیچی کئے ہوئے۔ سو لڑکیوں جیسا ایک لڑکا ہے۔ اتنا بڑا افسر ہونے کے باوجود، اب تک یہ حالت ہے کہ ماں چپت رسید کر دیتی ہے اور سامنے سے اُف نہیں کرتا۔ ایسا رشتہ مل جانا تو خدا کی رحمت ہے۔"

یہ آوازیں تھیں، جو چاروں طرف سے ابّا اور امّی کو گھیرتی چلی گئیں۔ اور بالآخر انھوں نے ہاں کر دی۔ مجھے بھی اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا ——— بدمعاشی اور سرکشی کی برائیاں تو اندھوں کو بھی دکھائی دے دیتی ہیں، لیکن شرافت اور فرمانبرداری کے غلط مفہوم کی تباہ کاریوں کا علم تجربہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ شادی بڑی دھوم سے ہوئی ——— ماں کا ایک ہی لاڈلا بیٹا۔ کیوں نہ دھوم سے ہوتی ——— آٹھ دس دن سلامیوں مبارکبادیوں میں گزر گئے۔ دلہن کے پاؤں دھو دھو کر پیئے گئے۔

شادی کو قریب دو ہفتے گزرے تھے کہ ایک شام میاں نے کہا کہ چلو پارک میں تفریح کے لئے چلیں۔ ماں نے پوچھا کہ تم لوگوں کے ساتھ کون جائے گا؟! بیٹے نے کہا کہ ہم دونوں جائیں گے۔ ماں نے کہا کہ "نہ بیٹا! یہ اکیلے جانے کا زمانہ نہیں۔" یہ کہا اور چادر لے کر ساتھ ہو لیں۔

اس کے بعد انھوں نے میرے دونوں "کراماً کاتبین" کو چھٹی دیدی اور یہ ڈیوٹی خود سنبھال لی۔ دن بھر گھر میں ہم دونوں اکیلی ہوتی تھیں ——— میاں دفتر چلے جاتے تھے ——— سارا دن میری کیفیت یہ ہوتی جیسے تھانے میں

پولیس آفیسر کے سامنے ملزم کھڑا ہے۔ "تمہاری دادی نے ایک دن میری پھوپھی سے یہ کہا تھا" "تمہاری نانی تو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ اب میں دیکھوں گی کہ اس کی ناک کیسے سلامت رہتی ہے۔" "تم کالجوں کی چھوکریاں شریفوں کے گھروں میں بسنے کے قابل نہیں رہتیں۔" "تمہاری ماں نے تعویذ دھاگے کرا کر میری عقل مار دی، ورنہ میں تمھیں اس گھر میں کیسے لے آتی؟" "دیکھو! آٹا گوندھتے پھر تمہارا سر ہل رہا ہے۔ میں کتنی بار اس سے منع کر چکی ہوں۔"

دن بھر یہ کچھ ہوتا اور شام کو معلوم بیٹے کو کیا ڈائری دی جاتی کہ وہ اپنے کمرے کے ایک کونے میں ہتھیلی پر سر رکھکر بیٹھ جاتے۔

"کیا بات ہے؟"

"تمھیں نہیں معلوم کیا بات ہے؟ میں کتنی مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ میں امّی کی ناراضگی کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنّت ہوتی ہے۔ ماں کی اطاعت، خدا کی اطاعت ہے۔ یہ خدا رسولؐ کا حکم ہے۔ مجھے تم سے بیحد محبت ہے، لیکن میری محبت خدا اور رسولؐ کے حکم پر غالب آجائے تو اس سے بڑا گناہ اور کونسا ہو سکتا ہے؟"

"خدا کے لئے یہ تو بتائیے کہ آخر بات کیا ہوئی ہے؟"

"تم نے امّی سے کہا کہ ...."

"میں نے یہ قطعاً نہیں کہا۔"

"اچھا تو میں اب امّی کو جھوٹا کہوں!"

وہ یہ باتیں، غصّہ اور گرج سے نہیں کرتے تھے۔ سر جھکائے، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے، ٹھنڈی سانسیں بھرتے، کرتے۔

اِدھر وہ یہ باتیں کرتے، اور اُدھر امّی جان باورچی خانے سے آوازوں پر آوازیں دیئے جاتیں۔

"میری بیٹی۔ آ بھی جاؤ ناں! دیکھو تمہاری یخنی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔ میں نے اسے آج خود تیار کیا ہے۔ تمہارا جوڑا بھی استری کر دیا ہے۔ تم یہ پیالی پی جاؤ تو میں تمہارے دوپٹے میں گوٹا ٹانک دوں۔ پھر میں نے تمہاری بھاوج کی طرف بھی جانا ہے۔ سُنا ہے ان کے دشمنوں کی طبیعت خراب ہے۔"

آجاؤ میری بیٹی!

سینما کے سیریل کی طرح یہ ڈرامہ ہر شام مسلسل چلتا تھا۔ ہر روز میرے خلاف ایک نیا الزام لگتا۔ اور پھر اس کی تشہیر کی جاتی۔ کبھی میاں کے سامنے صفائی پیش کرنے کا موقعہ ملتا تو وہ معمول کے مطابق ٹھنڈی سانس بھر کر کہہ دیتے کہ چلئے میں مانے لیتا ہوں کہ تم ٹھیک کہتی ہو، لیکن میں امّی کے خلاف کوئی شکایت نہیں سُننا چاہتا۔ یہ میری عاقبت

کا معاملہ ہے"۔ اور کبھی کہہ دیتے کہ "میں نے کبھی تمہیں کچھ کہا ہے؟

انہیں کون سمجھاتا کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اس سے زیادہ سخت کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا!

شروع شروع میں، میں نے ان باتوں کو اپنے تک ہی رکھا، لیکن جب میرے خلاف الزامات کی تشہیر ہونے لگی تو میں کبھی کبھار "اپنوں" سے اس کا ذکر کر دیتی۔ لیکن اس کا مجھے ہمیشہ یہ جواب ملتا کہ "ہمارے ہاں ایسا ہوا ہی کرتا ہے۔ یہ چند دن کی بات ہے۔ آخر میں سب ٹھیک ہو جایا کرتا ہے۔ یہ چھوٹی بات ہے کہ تمہارے میاں میں کوئی عیب نہیں؟!"

انہیں کون بتاتا کہ جس چیز کو وہ میرے میاں کا ہنر سمجھ رہے ہیں۔ اس سے بڑا عیب دنیا میں شاید ہی کچھ ہو۔ میری شادی کو بمشکل تین برس گزرے ہوں گے ـــــ اور میں یہ خط تپِ دق کے ہسپتال سے لکھ رہی ہوں۔ میرے میاں کو اس بات کا بے حد رنج ہے کہ میں نے اپنی صحت ناحق خراب کر لی۔ لیکن وہ مطمئن ہیں کہ انھوں نے بیوی کی محبت کو ماں کی اطاعت پر غالب نہیں آنے دیا اور اس طرح (بحمداللہ) ان سے وہ جنت نہیں چھنی جو ماں کے قدموں کے نیچے رکھی ہے۔

ان کی والدۂ محترمہ اپنے بے حد نیک بچے کے اس جذبۂ اطاعت پر بڑا فخر کرتی ہیں اور متأسف ہیں کہ ان کے غلط انتخاب کی وجہ سے ان کے ایسے شریف بیٹے کی زندگی تلخ ہو گئی۔

میرے مشفق باپ! آپ تو کہا کرتے ہیں کہ جنت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو جہنم ہو، لیکن یہاں یہ حالت ہے کہ ایک کی جنت دوسرے کے لئے جہنم ہے!

کیا ایک جنت ایسی بھی ہوتی ہے؟ ذرا اپنی طاہرہ بیٹیوں کو یہ تو بتا دیجئے! مجھے اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہنا!

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

آپ کی طاہرہ بیٹی

میں اس کا جواب اس سے زیادہ اور کیا دوں کہ

سینہ تمام داغ داغ پنبہ کجا کجا نہم

اس کا علاج قرآنِ کریم کی صحیح تعلیم کے بغیر ممکن نہیں۔ لیکن اتنے عرصہ میں جو قیمتی جانیں یوں جل کر راکھ کا ڈھیر ہو جائینگی ان کا خون بہا کون دیگا؟

چہ عجب کہ ان کا یہی خونِ ناحق معاشرہ میں صحیح قرآنی انقلاب کا موجب بن جائے۔ لیکن اس سے ان سسک سسک کے مرنے والیوں کی کیا تسلی ہو گی؟ غمزدہ پرویز۔

باب المراسلات

مرکزِ ملّت کی اطاعت

نوشہرہ سے ایک صاحب کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے:۔

"آپ کے لٹریچر سے ایک بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے کہ لفظِ رسول کے معنی مرکزِ ملّت (HEAD OF THE STATE) کے بھی ہیں اور وہ مرکزِ ملّت ہی کی حیثیت سے امت کے لئے مطاع ہے۔ ایک قاری کے ذہن میں لامحالہ چند سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ ان سوالات کا دلائل کے ساتھ تسلی بخش جواب دے کر مزید خلجان سے نجات دلائیں گے۔

ع۱ اگر رسول، بحیثیتِ رسول (اپنے اصل معنوں میں) نہیں بلکہ بحیثیتِ مرکزِ ملّت (HEAD OF THE STATE) مطاع ہے تو

(الف) کلمۂ طیبہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) میں محمدؐ کی رسالت پر ایمان لانے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور

(ب)۔ کلمہ کے اس جز کو مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے، جبکہ مرکزِ ملّت گاہ بگاہ بدلنے والی ہستی ہے

ع۲۔ قرآنِ پاک میں رسول کی جابجا غیر مشروط اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کی حیثیت اس مرکزِ ملّت (HEAD OF THE STATE) کی موجودگی میں کیا رہ جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی حائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرے۔

ع۳۔ کیا ان انبیاء کی جو کوئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اطاعت اُن کے امتیوں پر اُن کی وفات کے بعد ختم ہو جاتی تھی اور دوسرے نبی کے آنے تک وہ اپنی یا اُس ملک کے مرکزِ ملّت (HEAD OF THE STATE) کی مرضی پر برضا و رغبت زندگی گزارنے

کے مجاز تھے۔

۴۔ کیا خلافتِ راشدہ میں قرآن کے ساتھ ساتھ سُنّت کو بھی قانون کی اساس کا درجہ حاصل تھا یا نہیں؟۔

طلوعِ اسلام چونکہ آپ نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا تعلق طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ ایک بنیادی اصول سے ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب طلوعِ اسلام کے صفحات پر دیا جائے تاکہ دیگر قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

۱۔ نبی اکرمؐ کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے، حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہو سکتا تھا نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے۔ رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاء پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو (HEAD OF THE STATE) کہا جاتا ہے۔ ان ہر دو مراحل میں، حضورؐ کی اطاعت جماعتِ مؤمنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکزِ ملّت، حضورؐ کا جانشین، خلیفۃ الرسولؐ، یا امیر المؤمنین تھا، اور امّت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالتمآبؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اور خلافت، سلطنت میں تبدیل ہو گئی جس میں احکامِ خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا تھا اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اُسی قسم کی تھی، جس قسم کی دنیا کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکزِ ملّت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکزِ ملّت" صرف اُسی نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرے

اور امورِ مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام، خدا کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پرواہ نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوعِ اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام (مثلاً) غلام محمدؒ مرحوم یا اسکندر مرزا کو مرکزِ ملت اور ان کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ هٰذَا اِفْكٌ عَظِيْمٌ۔ طلوعِ اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس نے مرکزِ ملت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاج رسالت" کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی اس قسم کا نظام جو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا۔ جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآنِ کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵۔ جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین عملاً موجود نہیں رہتا۔ مذہب رہ جاتا ہے جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دیدیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ امتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی تنویت کارفرما ہے۔ شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق، اس طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدینؓ کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں بھی جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریقِ کار میں اختلافات ناگزیر ہیں۔ یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کر لی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکزِ ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اب خود اہلِ حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کر لیا ہے کہ یہ حدیث وضعی ہے)۔

۶۔ ایسا نظام، جس میں امت کو احکامِ خداوندی کے مطابق چلایا جائے پھر سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکزِ ملت" کہا جائے گا جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی کی اطاعت کریگا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے اس میں اسکے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہٖ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کر لیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافتِ علیٰ منہاجِ رسالت) قائم رہی، اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآنِ کریم نے جب امورِ مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشا تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ "تم پر میری سُنّت اور میرے خلفائے راشدین کی سُنّت واجب ہے"، تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حضورؐ کے زمانے کے فیصلوں کو ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہٖ رہنا مقصود ہوتا تو اس حدیث میں "خلفائے راشدین کی سُنّت" کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ایسے واقعات کا پتہ ملتا ہے، جن میں نبی اکرمؐ کے زمانے کے فیصلوں میں زمانۂ خلافت

میں تبدیلی کی گئی۔ اس کی تفصیل طلوعِ اسلام میں متعدد بار پیش کی جا چکی ہے۔ یہ "خلفائے راشدین" کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافتِ راشدہ مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے لیکر آج تک کے خلفاء خلفائے راشدین ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہو گیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جا سکتا ہے، جب وہی سلسلہ پھر قائم ہو جائے گا تو ان نئے خلفاءؓ راشدین کی سُنّت کی اطاعت واجب ہو جائے گی۔ اس سے مراد ہوں گے وہ فیصلے جو یہ نظام قرآن کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کریگا۔ اس سلسلہ میں وہ یقیناً ان فیصلوں کو بھی سامنے رکھیگا جو اس سے پہلے زمانۂ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ میں طے پائے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان فیصلوں کے ریکارڈ کو (جس طرح وہ ہم تک پہنچا ہے) یقینی طور پر صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن چونکہ اسلامی نظام کے لئے غلط اور صحیح کا بنیادی معیار قرآن کریم کے غیر متبدل اصول و احکام ہونگے اسلئے اسے سابقہ ریکارڈ کے پرکھنے میں بھی دقت نہیں ہوگی۔

یہ ہے اس باب میں طلوعِ اسلام کا مسلک جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم سے سمجھ سکے ہیں۔

مسئلہ خیر و شر

"میں فلسفہ کا طالب العلم ہوں۔ خیر و شر کے مسئلہ نے میرے دل میں کئی الجھنیں پیدا کر رکھی ہیں۔ آپ اس قدیم ابتدائی اعتراض سے تو واقف ہی ہوں گے کہ اگر شر (EVIL) خدا کی مرضی سے ہے تو خدا خیرِ مطلق نہیں ہو سکتا۔ اور اگر شر اس کی مرضی کے خلاف موجود ہے تو خدا قادرِ مطلق نہیں ہو سکتا۔ براہِ کرم اس مسئلہ کو صاف کر کے مجھے اس الجھن سے نکالئے۔"

طلوعِ اسلام یہ ملخص ہے اس سوال کا جو اس سلسلہ میں فلسفہ کے نوجوان طالب علموں کے دل میں اکثر و بیشتر پیدا ہوتا رہتا ہے۔ اور جس کے اطمینان بخش جواب کے لئے وہ مضطرب و بے قرار رہتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو کچھ ایسا مشکل نہیں تھا لیکن قدیم (اور ایک حد تک جدید) فلسفیانہ نکات آفرینیوں نے اسے ایسا الجھا دیا ہے کہ اسے حل کرتے کرتے طالب العلم کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ۔

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

آیئے! ذرا فلسفیانہ موشگافیوں سے ہٹ کر سوچیں اور عام فہم الفاظ میں سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ اور قرآنِ کریم کی تعلیم کی روشنی میں اس کا حل کیا ہے؟۔

پہلے یہ دیکھیں کہ شر (EVIL) کہتے کسے ہیں؟

پہاڑوں پر مینھ برستا ہے۔ وادیاں پانی سے بھر جاتی ہیں۔ ندی نالے چڑھ جاتے ہیں، لیکن سارا پانی دریاؤں کے راستے بہہ کر سمندر میں جا گرتا ہے۔ اسے کوئی شر سے تعبیر نہیں کرتا۔ لیکن جب یہی پانی دریاؤں کے کنارے اور نہروں کے بند توڑ کر بستیوں کا رُخ کرتا ہے اور گاؤں کے گاؤں تباہ ہو جاتے ہیں، تو ہم اس کے ہاتھوں چیخ اُٹھتے ہیں۔ اب یہ پانی شر بن جاتا ہے۔

جنگل میں سانپ اِدھر اُدھر پھرتے رہتے ہیں، کوئی انہیں شر سے تعبیر نہیں کرتا۔ لیکن جونہی کوئی سانپ کسی انسان

کو ڈس لیتا ہے تو اس کا زہر شر بن جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ کوئی شے شر اس وقت بنتی ہے جب اس سے انسان متاثر ہو۔ اگر کسی خطۂ زمین میں انسان نہ بستے ہوں تو وہاں روز آگ لگے، بجلی گرے، آتش فشاں پہاڑوں کے دہانے پھٹیں، زلزلے آئیں، جنگل میں شیر دھاڑیں، سانپ سرسراتے پھریں۔ ان میں سے کوئی شے بھی شر نہیں کہلائے گی۔

دوسری طرف دیکھئے، تو وہی پانی جو ساحل تا آشنا ہو کر تباہی کا موجب، لہٰذا شر بن گیا تھا، اگر ساحلوں کے اندر بہے اور اس سے کھیتوں کی سیرابی کا کام لیا جائے تو عین خیر ہو جائے گا۔

وہی سانپ کا زہر جو انسان کے جسم میں موت بن کر سرایت کر گیا تھا، جب دوائی کے طور پر استعمال کیا جائے تو زہر کا تریاق بن جاتا ہے۔ لہٰذا یکسر خیر۔

لہٰذا ان میں سے کوئی شے نہ خیر ہے نہ شر۔ ان سے انسان پر جس قسم کا اثر مرتب ہو، اس کی نسبت سے یہ خیر یا شر بن جاتی ہیں۔

۲۔ جن ملکوں نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ نہ ان کے دریاؤں کے ساحل ٹوٹیں نہ نہروں کے بند، وہاں پانی کی کثرت کبھی سیلاب کی بلا ہی نہیں بنتی۔ وہ اس سے مفیدِ مطلب کام لیتے ہیں، اور بقایا پانی سر جھکائے سیدھا سمندر میں جا گرتا ہے۔

جو لوگ احتیاط برتتے ہیں، انھیں سانپ کاٹتا ہی نہیں، اور جن ملکوں نے سانپ کاٹے کے علاج کے لئے جگہ جگہ طبی مراکز قائم کر رکھے ہیں وہاں کوئی مارگزیدہ مرتا نہیں۔ خود ہمارے ہاں ابھی کل تک باؤلے کتے کے کاٹنے سے قیامت برپا ہو جاتی تھی، لیکن اب وہ چند ٹیکوں سے زیادہ پریشانی کی بات ہی نہیں رہی۔

طاعون، ہیضہ، ٹائیفائڈ، ملیریا، چیچک، جو چند سال اُدھر تک بستیوں کی بستیاں اُجاڑ دیا کرتے تھے، اب ان کی یہ حالت ہے کہ جو ملک حفظِ ماتقدم کی تدابیر پر پورا عمل کرتے ہیں، وہاں یہ وبائی امراض بہت کم آتے ہیں، اور اگر آتے بھی ہیں تو ان کی فوری روک تھام کر لی جاتی ہے۔ ہمارے بچپن کے زمانے تک دانت نکلوانا بھی حشر برپا کر دیا کرتا تھا۔ آج کیفیت یہ ہے کہ مریض بیٹھا اخبار پڑھتا ہے اور ڈاکٹر اس کی ٹانگ کاٹ رہا ہوتا ہے۔ جہالت اور توہم پرستی کے شکار ملکوں میں، پیدائشی اندھے، لولے، لنگڑے۔ بہرے گونگے بچوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوتی، لیکن جو ممالک علم و عقل سے کام لیتے ہیں، وہاں ان کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب اس قسم کے معذور اور اپاہج بچوں کا سلسلہ ختم ہو جائے گا۔

یہاں تک ہم نے دیکھ لیا کہ جس حد تک قوانینِ فطرت کا تعلق ہے، شر صرف اس وقت تک موجود رہتا ہے جب تک ان قوانین کا علم حاصل نہ کیا جائے، یا ان کے مطابق زندگی بسر نہ کی جائے۔ یعنی شر انسان کی اپنی جہالت اور بے احتیاطی

سے پیدا ہوتا ہے۔ خالقِ کائنات نے انسان میں اس امر کی پوری پوری صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ قوانینِ فطرت کا علم حاصل کر سکے اور کائناتی قوتوں کو مسخر کر کے، انھیں اپنے کام میں لائے۔ جن حادثات کو ابھی تک (CHANCE) کہا جاتا ہے، ان کے اسباب و علل کے متعلق تحقیق نہیں ہو سکی۔ جوں جوں تحقیقات کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا (CHANCES) کا میدان سکڑتا چلا جائے گا۔

اب انسانی دنیا کی طرف آیئے۔ ایک بچہ غریب کے گھر پیدا ہوتا ہے اور ساری عمر مشقتیں اُٹھاتا اور مصیبتیں جھیلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی دوسرا بچہ امیر ماں باپ کے ہاں پیدا ہوتا ہے اور بلا محنت اور مشقت کئے، عیش کرتا ہے۔ اوّل الذکر کے لئے یہ دنیا شر ہے۔ مصیبت کا مقام ہے جیل خانہ ہے۔ لیکن ذرا سوچیئے کہ یہ شر کیوں ہے؟ محض اس لئے کہ ہمارے معاشرہ نے ایسا غلط نظام قائم کر رکھا ہے جس کی رُو سے دولت اور آسائش کی تقسیم، ضرورت کے لحاظ سے نہیں ہوتی بلکہ پیدائش کی نسبت سے ہوتی ہے۔ اگر اس غلط نظامِ معاشرت و معیشت کی جگہ صحیح (قرآنی) نظام متشکل کر دیا جائے تو یہ شر، خیر سے بدل جائے۔ اس نظام میں، مصیبت، مشقت، تکلیف، مفلسی، محتاجی کا وجود ہی باقی نہیں رہتا۔ چونکہ اقتدار اور دولت کے مالک طبقہ کے لئے غلط نظام، فائدہ مند رہتا ہے اسی لئے وہ اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھنے، بلکہ اسے مستحکم کرنے کے لئے ہر ممکن تدبیر سوچتا رہتا ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ کارگر اور کامیاب تدبیر یہ ہے کہ غریبوں اور مفلسوں کے دل میں یا تو یہ عقیدہ راسخ کر دیا جائے کہ ہر انسان کی پیدائش اس کے سابقہ جنم کے اعمال کے مطابق ہوتی ہے۔ جو بچہ غریبوں کے ہاں پیدا ہوا ہے، اُس نے پچھلے جنم میں اچھے کرم نہیں کئے تھے۔ جو اربابِ اقتدار و ثروت کے ہاں پیدا ہوتا ہے، سابقہ جنم میں اس کے اعمال بہت اچھے تھے۔ اور یا یہ عقیدہ محکم طور پر دلنشین کر دیا جائے کہ رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، وہ جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے مفلس اور محتاج کر دے۔ یہ سب انسان کی تقدیر ہے، جو خدا کی بنائی ہوئی ہے۔ اس لئے کسی غریب کا اپنی غریبی کے خلاف شکایت کرنا، درحقیقت خدا کے خلاف شکوہ کرنا ہے کہ اس نے اس کی تقدیر ایسی کیوں بنا دی۔ وہ مالک الملک ہے۔ قادرِ مطلق ہے۔ سب کچھ اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس میں کسی کو دم مارنے کی جا نہیں۔

یہ سب عقائد اس لئے پیدا کئے جاتے ہیں کہ غریبوں اور محتاجوں کا دھیان ہی اس طرف نہ آنے پائے کہ ہماری مصیبتوں اور پریشانیوں کا ذمہ دار بالادست طبقہ اور اس کا مسلط کردہ غلط نظام ہے، جس ملک میں جس حد تک غلط نظام کی جگہ صحیح نظام آتا جاتا ہے، وہاں اسی قدر، مفلسوں اور محتاجوں کے پچھلے جنم کے کرم اچھے ہوتے چلے جاتے ہیں، اور آئے دن قوم کی تقدیریں بدلتی چلی جاتی ہیں۔

خیر و شر کے مسئلہ میں سب سے اہم اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ دنیا میں انسان غلط راستوں پر چلتے ہیں (جرم اور گناہ کرتے ہیں) اگر خدا چاہتا تو یہ بُرائی کر ہی نہ سکتے۔

ظاہر ہے کہ اس سوال کا تعلق، خیر و شر کے بجائے انسان کے صاحبِ اختیار و ارادہ ہونے (HUMAN FREEDOM) سے ہے۔ انسان کی اس آزادیٔ فکر و انتخاب کے معنی یہ ہیں کہ اسے زندگی کے دوراہے پر اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ جون سا راستہ جی چاہے اپنے لئے منتخب کرے۔ اس کا اختیار و ارادہ ہی اسے اشیائے کائنات سے ممتاز کرتا ہے، اسی پر اخلاقیات کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے، اور اس سے ہر فرد اپنے فیصلے اور عمل کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ اگر انسان کو مجبوراً نیکی کے راستے پر چلانا مقصود ہوتا، تو اسے حیوانات کی طرح ایک ہی راستے پر چلنے کے لئے مجبور پیدا کیا جاتا۔ انسان کو حیوانات سے بلند سطح کی زندگی عطا کی گئی ہے۔ یہ خود زندگی کے ارتقائی سفر میں ایک نئی منزل ہے جو سابقہ منازل سے یکسر منفرد ہے۔ یوں سمجھئے کہ یہاں سے زندگی کا ایک نیا ارتقائی پروگرام شروع ہوا ہے جو موت کے بعد بھی برابر جاری رہے گا۔ انسان کا شرف و مجد اس لئے ہے کہ یہ اپنے اختیار و ارادہ سے صحیح راستے کا انتخاب کرتا ہے۔ جو کام مجبوراً کیا جائے اس میں نیکی اور بدی یا ثواب اور عذاب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ مجبوری کا ولی ولی ہوتا ہے، نہ مجبوری کا شیطان، شیطان۔ کیریکٹر کہتے ہی اُسے ہیں کہ انسان اپنے اختیار و ارادہ سے پست میلانات کو چھوڑ کر بلند اقدار کی حفاظت کرے۔ اسی کو عملِ صالح کہتے ہیں۔

قصۂ آدم میں، آدمی کا پہلا تعارف، اس کی معصیت سے کرایا گیا ہے۔ یعنی خدا کے حکم کی خلاف ورزی سے۔ اس کے باوجود، ملائکہ آدم کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ ملائکہ مجبور ہیں اور آدم صاحبِ اختیار و ارادہ۔

جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو قوانینِ خداوندی کے مطابق استعمال کرتا ہے تو اس کا نتیجہ خیر ہوتا ہے۔ اور جب اسے ان قوانین کے خلاف استعمال کرتا ہے تو اس کا نتیجہ شر کہلاتا ہے۔ لہٰذا خیر و شر کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ انسان اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا استعمال کس طرح سے کرتا ہے۔

چونکہ انسان کو اختیار و ارادہ خدا نے عطا کیا ہے، اس لئے اس سے اس کے قادرِ مطلق ہونے پر کوئی حرف نہیں آتا اور یہ اس کی شانِ خداوندی ہے کہ جو اختیارات انسان کو دیدیئے ہیں انھیں چھینتا نہیں۔ نہ ہی ان میں دخل دیتا ہے۔ جو پابندیاں خدا نے اپنے لامحدود اختیارات پر خود عائد کر رکھی ہیں۔ وہ ان پر قائم رہتا ہے۔ یہی خدا کے شایانِ شان تھا۔

انتہائی حسنِ اہتمام سے مفہوم القرآن کی طباعت کا آغاز

کتاب بالاقساط شائع کی جارہی ہے۔ مفکرِ قرآن محترم پرویز کی زندگی بھر کی بے مثال فکری کاوشوں سے مستفید ہونے کے لئے ابھی سے دس روپے (کم از کم) بمدِ پیشگی ارسال فرمادیجئے۔ ——— میزان پبلیکیشنز

آپ نے غلط سمجھا ہے

اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ **لغات القرآن**، محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری ہے، تو آپ نے غلط سمجھا ہے۔ یہ ڈکشنری نہیں۔ اس میں

(۱)۔ تمام قرآنی الفاظ کے معانی، عربی زبان کی مستند کتبِ لغت اور خود قرآنِ کریم کی روشنی میں متعین کئے گئے ہیں۔ اتنے حصّہ کو آپ لغات کہہ سکتے ہیں۔

(۲)۔ قرآنِ کریم کی ان آیات کا مفہوم وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ تفسیر القرآن کا ہے۔

(۳)۔ دین کے تمام بنیادی تصوّرات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصّہ، دین کی بنیادی تعلیم کا نصاب ہے۔

(۴)۔ شروع میں عربی زبان کے بنیادی قواعد و اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ عربی زبان کا معلّم ہے۔

(۵)۔ تمام قرآنی الفاظ کی ایک جامع فہرست ہے۔ ہر لفظ کے سامنے اس کا مادّہ دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا انڈکس ہے۔

آپ ایک مرتبہ اس لغات کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں تو قرآنِ کریم کے سمجھنے اور دین کے بنیادی اصولوں کو جاننے کے لئے آپ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہیگی۔

یہ ہے وہ کتاب، جسے آپ نے، غلطی سے، محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری تصوّر کر رکھا ہے۔ کتاب چار جلدوں میں بڑے پاکیزہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہے۔

قیمت مجلّد:-

پہلی تین جلدیں:- پندرہ روپیہ فی جلد

چوتھی جلد:- بارہ روپیہ فی جلد

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

صدرِ پاکستان کا پیغامِ عید

[گذشتہ عید الاضحیٰ کی تقریبِ سعید پر، محترم صدرِ مملکتِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے جو پیغام نشر فرمایا تھا، وہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ یہ پیغام اخبارات میں شائع ہوا تھا، (بعض جگہ اختصار کے ساتھ اور بعض میں پورے کا پورا) لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اسے 'طلوعِ اسلام' کے اوراق میں محفوظ کر لیا جائے۔ یہ پیغام اردو زبان میں تھا، اور انگریزی میں اس کا ترجمہ شائع ہوا تھا۔ ہم اسے 'نوائے وقت' کے حوالے سے شائع کر رہے ہیں]

(طلوعِ اسلام)

عزیز ہم وطنو! عید مبارک! عید الاضحیٰ کا مبارک دن، اس عظیم الشان قربانی کی یادگار ہے جو محض اللہ کی راہ میں اس کی خوشنودی کے لیے مکمل بے غرضی کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔

اگر مسلمانوں نے اس جذبہ کی صحیح روح پر عمل کیا ہوتا تو آج دنیا میں ان کی حالت کچھ اور ہوتی۔ لیکن قربانی کی رسم تو باقی رہ گئی اور اس کے پیچھے جو ابراہیمیؑ روح تھی وہ روایات میں کھو گئی ـــــ یہ حال صرف قربانی کی رسم ہی کا نہیں ہوا، بلکہ اسلام کے بہت سے دوسرے سنہری اصولوں کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ صدیوں سے ہم نے مذہب کو علمی زیادہ اور عملی کم بنا رکھا ہے۔ علم میں بھی ہم نے مذہب کی رُوح کو روایات میں جکڑ کر ماضی کا قیدی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اکثر لوگ کتابی اسلام سے تو ضرور کچھ نہ کچھ واقف ہیں، لیکن مذہب کے اس پہلو سے بہت دور ہیں جو زندگی کا لازمی حصہ ہونا چاہیے۔

ماضی کی چار دیواری

بڑھتی ہوئی تعلیم اور ترقی کے اس زمانے میں زندگی کی رفتار بے حد تیز ہو گئی ہے، اور انسان کا ذہن بہت سی ان حدود سے آزاد ہو گیا ہے جو بے علمی کی وجہ سے قائم تھیں۔ آج کا ذہن صرف اسی بات کو قبول کرے گا جو سائنس اور علم کے اس عجیب و غریب دور میں اسے مطمئن کر سکے۔ اگر ہم نے مذہب کو ماضی کی چار دیواری میں قید رکھا تو یہ خطرہ ہے کہ حال و مستقبل کے بہت سے

لوگ لادینی کا شکار ہو جائیں گے۔

عزیز ہموطنو! ہم لوگ اس بات پر فخر کرنے کے عادی ہیں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر جائز ترقی کا ساتھ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ لیکن یہ دعویٰ صرف بیان کر دینے ہی سے ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو عملی طور پر بھی ثابت کر کے دکھائیں۔ اس مقصد کے لئے دو باتیں بہت لازمی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اسلام کے اصولوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں اور دوسرے یہ کہ اپنے زمانے اور ماحول کی روشنی میں ان پر عمل کرنے کی راہیں تلاش کریں۔

ابدی اصول کلامِ پاک کے اندر ہیں

جہاں تک اسلام کے اصولوں کا تعلق ہے انہیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے کلامِ پاک میں وضاحت سے بیان فرما دیا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگرچہ قرآنِ شریف تبرک کے طور پر پڑھا اور پڑھایا تو ضرور جاتا ہے، لیکن اس کو سمجھنے کی زیادہ کوشش نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے عقائد اور عمل میں ایک بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔

اصول، خواہ دینی ہوں یا دنیوی، اس لئے نہیں بنائے جاتے کہ ان کو بُت بنا کر ان کی پرستش کی جائے۔ اصول تو صرف اس لئے بنتے ہیں کہ ان پر صحیح طور پر عمل کیا جائے۔ اصول اپنی جگہ بنیادی ہوتے ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آیا کرتی۔ لیکن اصولوں پر چلنے کے انداز ہر زمانے اور ہر ماحول کے مطابق ترقی کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو علم اور عمل الگ الگ راہوں پر چلنے لگتے ہیں اور ان میں کوئی رابطہ قائم نہیں رہ سکتا؛ مثال کے طور پر جب بجلی پیدا کرنے کا اصول ایجاد ہوا تو پہلے پہلے جو شخص ہاتھ لگاتا تھا صرف جھٹکے لگتے تھے۔ پھر جیسے جیسے انسان کا علم بڑھتا گیا ویسے ویسے بجلی کو استعمال کرنے کے نئے نئے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔ چنانچہ آج اس بجلی سے روشنی پیدا ہوتی ہے پنکھے چلتے ہیں، وائرلیس اور ٹیلی ویژن کی لہریں پھیلتی ہیں اور بڑی طاقت والے ہوائی جہاز اُڑتے ہیں۔ ان سب ترقیوں کے باوجود بجلی کی حقیقت اور اس کو بنانے کے بنیادی اصول قائم ہیں اور ان میں کسی قسم کا بھی تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

سُنّت۔ حدیث اور فقہ

یہی حال روحانی دنیا کا ہے۔ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے اصول ازلی اور ابدی ہیں، اور ان پر ہر زمانہ اپنے تقاضوں کے مطابق چل سکتا ہے۔ سُنّت، حدیث اور فقہ، سب اس بات کا ثبوت ہیں۔ یہ سب ہمارے لئے روشنی کے مینار ہیں، جو ہمیں بتلاتے ہیں کہ کس زمانہ میں اور کن کن حالات میں خدا کے احکام پر کس کس طرح عمل کیا گیا؟

روشنی کے مینار رہنمائی کے لئے ہوتے ہیں، جمود کے لئے نہیں۔ جمود تو تاریکی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ ترقی کا راز تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بنیادی اصولوں کو اچھی طرح سمجھیں۔ ان پر مضبوطی کے ساتھ ثابت قدم رہیں اور پھر ماضی کو مشعلِ راہ بنا کر حال اور مستقبل کی دنیا میں عمل کی نئی نئی راہیں تلاش کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسلام تو اپنی جگہ سلامت رہے گا۔

لیکن مسلمان دنیا اور آخرت کی زندگی میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہ ایک بہت بڑا ظلم ہوگا۔ کیونکہ اسلام فقط اپنی ذات کے لئے زندہ رہنے کے لئے نہیں آیا۔ بلکہ اس دنیا میں بھی اور دوسری دنیا میں بھی مسلمانوں کو سربلندی کے ساتھ زندہ رکھنے کے لئے آیا ہے۔

اسلام اور پاکستان

ایک اور ضروری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اسلام کی جتنی ضرورت پاکستان کو ہے۔ اتنی کسی اور کو نہیں۔ اگر خدانخواستہ دنیا کے دوسرے ممالک اسلام سے دور بھی ہو جائیں تو آخرت کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کم از کم اس دنیا میں ان کی قومیت اپنی جگہ قائم اور سلامت رہے گی۔ پاکستان کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارا ملک اسلام کے نام پر بنا ہے اور صرف اسی نام پر یہ زندہ بھی رہ سکتا ہے۔ اسلام کے علاوہ ہماری قومیت اور سالمیت کی اور کوئی بنیاد نہیں۔ یہ بنیاد صرف تصور اور نظریہ پر نہیں، بلکہ عمل پر قائم رہ سکتی ہے۔ جیسے جیسے ہمارے ایمان اور عمل میں ہم آہنگی بڑھتی جائے گی، اسی طرح پاکستان بھی مضبوط ہوتا جائے گا۔ ورنہ اگر ہمارے ایمان اور عمل میں تضاد پیدا ہوتا گیا تو یہ شدید خطرہ ہے کہ پاکستان کا وجود بھی کھوکھلا ہو کر منتشر ہونے لگے گا۔ چنانچہ اگر روحانی اور اخلاقی مقاصد کے لئے نہیں تو کم از کم اپنی قومی بقا اور سلامتی کے لئے ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم اسلام کا دامن مضبوطی سے پکڑے رکھیں اور اس پر سچائی اور اخلاص سے عمل کریں۔ اسلام کا دامن مضبوطی سے تھامنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ہم قرآنِ کریم کو زیادہ سے زیادہ پڑھیں، اس کی حکمت اور احکام پر غور کریں اور پھر اپنے نئے اور پرانے علم کی روشنی میں وہ راستے تلاش کریں۔ جن پر چل کر ہم آجکل کی دنیا میں ہر لحاظ سے اچھے مسلمان اور اچھے انسان بن کر رہ سکیں۔

قرآن سمجھ کر پڑھیں

میں آپ سے پرزور اپیل کرتا ہوں کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے آپ اپنے علم اور عمل کی ساری صلاحیتوں کو پورے طور پر کام میں لائیں۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں کسی سرکاری، غیر سرکاری مجلس یا تقریب میں قرآنِ شریف کی تلاوت کی جائے وہاں ان آیات کا آسان اور عام فہم ترجمہ بھی ضرور سنایا جائے اور پھر اس بات پر روشنی ڈالی جائے کہ ان آیات میں جو جو احکام یا اصول بیان ہوئے ہیں، آجکل کی زندگی میں ان پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ کام صرف ذاتی یا انفرادی طور پر ہی نہیں بلکہ ایک منظم تحریک کے طور پر جلد از جلد شروع ہونا چاہیئے تاکہ ہم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تعمیل کر سکیں جس میں بار بار یہ تاکید کی گئی ہے۔ کہ قرآنِ شریف کی آیات پر غور و فکر کرو تاکہ ان کی حکمت اور بصیرت کا نور حاصل کر سکو۔ اس سلسلہ میں عوام کے نمائندہ ادارے، مثلاً بنیادی جمہوریتوں کی مختلف کونسلیں کارپوریشنیں۔ میونسپل کمیٹیاں، وغیرہ بہت بڑا کام کر سکتی ہیں۔ میں ان سب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ باضابطہ پروگرام بنا کر وسیع پیمانہ پر اس تحریک کو شروع کریں، تاکہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے علاوہ ہر گاؤں، ہر گلی، ہر محلہ میں قرآنِ پاک کے درس جاری ہو جائیں، جن میں قرآنِ پاک کی تعلیم، اور اس تعلیم پر عمل کے طریقوں پر خاص طور سے زور دیا جائے۔ جہالت اور گمراہی کے خلاف یہ ایک ایسا جہاد ہے، جس میں ہر مسلمان کو ایک جانباز سپاہی کی طرح شامل ہونا چاہیئے۔

خاص طور پر اس طبقہ کو بھی اِس طرف توجّہ دینی چاہیے جو تعلیم یافتہ اور مہذّب ہے۔ اور جسے ہم باشعور طبقہ کے نام سے پکارتے ہیں، تاکہ مذہب کو ایک دقیانوسی چیز سمجھ کر اس کا مذاق اڑانے کا فیشن ختم ہو جائے۔ اور یہ طبقہ پاکستان کی آزادی اور نسب العین کی حفاظت اور رہنمائی کر سکے۔ اگر ہم نے غفلت سے کام لیا اور خدا کے تبلائے ہوئے صراطِ مستقیم کی صحیح طور پر تلاش نہ کی تو مجھے ڈر ہے کہ ہمارا روحانی۔ اخلاقی۔ مادّی اور قومی وجود انتہائی خطرہ میں پڑ جائے گا۔ میری درخواست ہے کہ آپ میری اپیل پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ اور اس کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کریں۔ خدا آپ کا مددگار ہو۔

اسلام پر کیا گذری

ہر شخص کو اعتراف ہے کہ جو اسلام اِس وقت ہم میں رائج ہے، وہ اُس اسلام سے مختلف ہے جسے نبی اکرمؐ نے پیش کیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ حقیقی اسلام، بعد والے اسلام میں کس طرح بدل گیا؟ ہمارے مروجہ (غیر اسلامی) خیالات اور نظریات کہاں سے آ گئے۔ مصر کے نامور مورّخ

علّامہ احمد امین مرحوم

نے اس موضوع پر بڑی تحقیق کی ہے اور اسے اپنے تاریخی سلسلہ میں مسلسل پیش کیا ہے۔ ان کی تاریخ کا پہلا حصّہ

فجر الاسلام

(اردو میں) اس سے پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب اس کا دوسرا حصّہ

ضحیٰ الاسلام

(اردو میں) شائع کیا گیا ہے۔ نادر معلومات۔ دلچسپ کوائف۔ علمی بحثیں۔ سادہ اور سلیس زبان قیمت چار روپے۔ (فجر الاسلام کی ضخامت دوگنی ہے، اس لئے اس کی قیمت آٹھ روپے ہے)۔ جلد فرمائش بھیجئے۔ دونوں کتابیں منگانے پر محصول ڈاک معاف۔

منگانے کا پتہ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

عائلی قوانین کے متعلق
مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور صدرِ مملکتِ پاکستان
کے درمیان خط و کتابت

[حال ہی میں وہ خط و کتابت شائع ہوئی ہے جو عائلی قوانین کے متعلق، محترم مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور صدرِ مملکتِ پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے درمیان ہوئی ہے۔ ہم اسے روزنامہ کوہستان کے حوالہ سے ذیل میں درج کرتے ہیں۔ طلوعِ اسلام]

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا مکتوب صدرِ مملکتِ پاکستان کے نام

بگرامی خدمت، عالی جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب، صدرِ مملکتِ پاکستان۔ السلام علیکم۔ ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ پاکستان کو ظاہری اور باطنی ترقیات عطا فرمائے اور ہر طرح کے فتنوں اور آفتوں سے محفوظ رکھے۔ جنابِ عالی! میں پاکستان کا ایک شہری اور دینِ اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں جو پاکستان کو مسلمانوں کی دینی و دنیاوی اہم ضرورت سمجھ کر قیامِ پاکستان کی جدوجہد کے وقت مقدور بھر خدمت میں رہا۔ اور بننے کے بعد اس کو اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت سمجھتا ہوں، اور دنیا میں میری سب سے بڑی خوشی اس مملکت کا استحکام و ترقی اور سب سے بڑا رنج اس کا ادنیٰ سا ضعف اور انتشار ہے۔ میں نے بغیر کسی سابقہ تعارف اور وسیلے کے آپ تک اپنے کلمات پہنچانے کی جرأت اس لئے کی کہ مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ حق بات کو سننے اور قبول کرنے میں بڑے فراخ حوصلہ ہیں۔ میں نہ سیاست سے کچھ شغف رکھتا ہوں اور نہ امراء و حکام سے مکاتبت و مراسلت یا ان تک پہنچنے کا عادی ہوں۔ صرف اسلام اور پاکستان کی محبت اور آپ کے متعلق نیک گمان اور اچھی توقعات نے مجھے یہ کلمات لکھنے پر آمادہ کیا۔ خدا کرے کہ خالص ہمدردی اور دل سوزی سے نکلے ہوئے یہ چند کلمات جناب تک پہنچ جائیں۔ اور آپ اطمینان کے ساتھ ان پر

غور فرمائیں۔

اسلام اتحاد کی بنیاد ہے

جنابِ والا، مجھے آپ کے متعدد بیانات سے یہ بالکل واضح ہو چکا ہے کہ حقیقت اچھی طرح آپ کے پیشِ نظر ہے کہ اسلام پاکستان کی رُوح ہے۔ نہ اس کے بغیر اس کا وجود میں آنا ممکن تھا اور نہ اس کے بغیر اس کا باقی رہنا امکان میں ہے۔ ملک کے دونوں بازوؤں میں مشرقی اور مغربی کے طویل فاصلے اور زبان اور معاشرت کے اختلاف کے علاوہ ان دونوں علاقوں کے اندر وطنی، خاندانی زبانوں اور معاشرتوں کا ایسا اختلاف ہے کہ اس ملک کے باشندے اگر عام دنیا کی طرح وطنی، لسانی، نسلی اور لونی وحدتوں کی بنیاد پر پورے پاکستان میں کوئی وحدت پیدا کرنا چاہیں تو اسکا قطعاً کوئی امکان نہیں۔ یہاں انگلینڈ، امریکہ، روس اور جرمنی کے سیاسی تصوّرات سے کوئی وحدت قائم نہیں کی جا سکتی ہے۔ اسلام ہمالہ وہ نقطۂ وحدت ہے، جس کے درمیان کوئی پہاڑ اور دریا حائل نہیں ہو سکتا۔ نسلی اور وطنی قومیتیں تو کیا حائل ہوتیں۔ تحریکِ قیامِ پاکستان کے وقت اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے کہ پنجابی، بنگالی، پٹھان، بلوچی، سندھی وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے نسلی اور لسانی امتیازات کو یکسر چھوڑ کر، صرف اسلام کے نام پر ایسے متحد ہوئے کہ دنیا حیران رہ گئی، اس لئے پاکستان کے پورے نظم و نسق میں ہمیں کسی وقت یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہمارے کسی قدم پر اسلامی شعائر اور مذہبی اقدار مجروح نہ ہوں۔ بلکہ جتنا ہم ان کو سربلند کریں گے، اتنا ہی پاکستان مضبوط اور سربلند ہوگا۔

عامۃ المسلمین کا ہیجان و اضطراب

اس وقت سوئے اتفاق سے متعدد ایسے امور پیدا ہو رہے ہیں، جن کے باعث عامۃ المسلمین میں شدید ہیجان و اضطراب رونما ہو رہا ہے، اور یہ احساس کیا جا رہا ہے کہ اسلامی شعائر و اقدار کو مجروح کیا جا رہا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ عائلی کمیشن آرڈیننس ہے۔ سردست دیگر مسائل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے، اس کے متعلق بربنائے اخلاص و دل سوزی چند معروضات پیش کرنا چاہتا ہوں، جیسا کہ میں نے عرض کیا، نہ میں کوئی سیاسی آدمی ہوں اور نہ ان شعبوں سے کوئی خاص شغف رکھتا ہوں۔ ساری زندگی درس و تدریسِ علومِ شرعیہ اور فتوے کے کام میں گزری۔ قیامِ پاکستان کی تحریک کے سلسلے میں بھی کسی سیاسی جماعت میں باقاعدہ شرکت کے بغیر دینی نقطۂ نظر سے پوری سرگرمی کے ساتھ حمایت کی اور اس بنا پر دارالعلوم دیوبند سے جہاں ستائیس سال معلم اور مفتی کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ کنارہ کشی اختیار کی۔ پاکستان میں بھی کچھ زمانہ تو دستور ساز اسمبلی کے مقرر کردہ بورڈ تعلیماتِ اسلامی کے رکن کی حیثیت سے دستوری مسائل کی دینی تحقیق میں یا حکومت کے مقرر کردہ لا کمیشن کے رکن کی حیثیت سے اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ قوانین کی اصلاح کی تجاویز میں صرف ہوا۔ ورنہ یہاں بھی میری ساری سرگرمیوں کا مرکز اصلی یا ایک دینی مدرسہ ہے۔ یا فتوے کا کام۔ خصوصاً موخر الذکر کام اس نوعیت کا ہے۔ کہ اب جب کہ تیس (۳۰) سال کی مدت فتووں کی خدمت انجام دیتے ہوئے ہو چکی ہے۔ تو ہند و پاکستان ہی نہیں، بیرونی ممالک

سے بھی مذہبی مسائل سے متعلق بکثرت سوالات آتے رہتے ہیں، اور میں اپنے علم و بصیرت کی حد تک اللہ و رسول کا حکم بتا دیتا ہوں۔ رویتِ ہلال اور عائلی قوانین کے آرڈیننس کے متعلق بھی سوالات کی بھرمار ہو رہی ہے۔ ایسے عمومی سوالات کا جواب انفرادی طور پر دینے کی بجائے یہ زیادہ سہل اور موزوں ہوتا ہے کہ بغرضِ افادۂ عام اخبار یا رسالے کے ذریعہ مسئلہ کی وضاحت کر دی جائے۔ مگر بعض اوقات ملک میں اس سے بےچینی اور اضطراب بڑھنے کا خدشہ ہوتا ہے، جسے حتی الوسع روکنا ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ ایسی ہی صورتِ حال اس وقت بھی درپیش ہے۔ مختلف گوشوں سے سوالات چلے آ رہے ہیں۔ مکمل سکوت اختیار کرنا ممکن نہیں ہے۔ اخبارات کے ذریعے مسئلہ کی وضاحت خلفشار کا موجب ہو سکتی ہے، جو کسی طرح پسندیدہ نہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس وقت جو سب سے زیادہ اہم قضیہ سامنے ہے، یعنی عائلی قوانین کا مسئلہ۔ اس کے متعلق سب سے پہلے کچھ ضروری معلومات اور دینی نقطۂ نظر آپ کے سامنے اس توقع اور تمنا کے ساتھ پیش کر دوں کہ آپ حق پسندی سے کام لے کر اس کا ایسا حل نکال لیں گے جو مسلمانوں کے اس اضطراب و خلفشار، اور احساسِ مظلومیت کو دور کر دے۔ کہ ان کے قوانین کا جو حصہ کفّار کے تسلّط کے دوران محفوظ رہ گیا تھا، آج وہ بھی مسخ و مجروح کیا جا رہا ہے۔

تجدّد کی پہلی قسط

سرِدست محض نمونہ کے طور پر اس ایک مسئلہ کے چند پہلوؤں کے متعلق اجمالاً اظہارِ خیال کرتا ہوں اس کے متعلق یا دوسرے مسئلے (رویتِ ہلال کے متعلق) اگر تفصیلی معلومات کی ضرورت محسوس فرمائیں تو انھیں بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ آپ مسئلہ کے تمام گوشوں پر نظر ڈال لیں اور غور فرمائیں اور ایسی راہ اختیار کریں جو شریعتِ اسلامی کے تحفظ کی ضامن ہو۔ اور عامۃ المسلمین کے قلوب کے لئے باعثِ اطمینان ہو، مجھے نہیں معلوم کہ بیرونِ پاکستان میں بھی مسلمان عوام اور اہلِ علم اسے جس نظر سے دیکھتے ہیں وہ آپ کے علم میں ہے یا نہیں۔ بہرحال اس کا تھوڑا سا اندازہ مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کے (جن سے غالباً آپ علی گڑھ کے زمانے سے واقف ہوں گے، اور جن کا انگریزی یا اردو ترجمہ و تفسیرِ قرآن بھی شاید آپ کے مطالعہ میں آیا ہو) اس تبصرہ سے ہو سکتا ہے جو انھوں نے اپنے قدیم و مشہور اخبار 'صدق لکھنؤ' مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۶۱ء میں کیا ہے۔ آپ کی سہولت کے لئے اس کے چند جملے نقل کرتا ہوں، جو اس قانون کی دفعات پر دینی حیثیت سے نکتہ چینی کے بعد لکھے ہیں: "کہنا چاہئیے کہ اس فرمان سے حکومت نے تجدد کی پہلی قسط اپنے ملک پر نازل کر دی۔ اور شریعت میں وہ مداخلت وہ ترمیم یہ مسلم حکومت کر گزری جس کی ہمّت نہ کبھی انگریزی حکومت نے کی تھی، اور نہ وہاں تک ہندوستان کی سیکولر حکومت کے قدم ابھی تک پہنچے ہیں۔"

پاکستان میں سیاسی پارٹیوں کا دس سالہ دورِ حکومت کا نصف آخر غالباً زیادہ خلفشار اور بہت سی غلط کاریوں کا دور رہا ہے۔ آپ نے برسرِ اقتدار آ کر بہت سی غلط کاریوں کا ازالہ اور مختلف شعبوں کا از سر نو جائزہ لینے اور ان کی اصلاح کا اعلان کیا۔ چنانچہ زرعی تعلیمی اور دیگر متعدد شعبوں کی اصلاحات کے لئے کمیشن مقرر ہوئے۔ اس دور کی ایک یادگار ازدواجی کمیشن کی سفارشات بھی ہیں، جنھیں عوام کی شدید ناپسندیدگی کے پیشِ نظر ان حکومتوں نے نافذ کرنے سے احتراز

کیا۔ کاش آپ اس دَور کے بدترین ترکے کو اپنانے کی بجائے اس شعبہ میں بھی کوئی کمیشن مقرر کر دیتے تو بہت بہتر ہوتا۔

بے اطمینانی کی آگ

بہرحال، اب بھی اگر آپ نے اطمینان کے ساتھ غور فرمایا، جس کی مجھے قوی امید ہے۔ تو آپ سے مخفی نہ رہے گا کہ ان سفارشات کا بیشتر حصہ روحِ اسلامی اور احکامِ اسلامی دونوں کے منافی ہے۔ اور ان کے نفاذ کی کوشش خواہ کتنے ہی مخلصانہ عزائم کے ساتھ ہو۔ عامۃ المسلمین کے لئے شدید خلفشار، بددلی، بے چینی کا موجب ہوگی۔ جو ظاہر ہے کہ کسی طرح ملک و ملت کے لئے کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔ اگرچہ بہ جبر اس کے نفاذ میں کامیابی بھی ہوگئی تو یہ خوش آئند صورت نہ ہوگی کہ عوام کے دلوں میں اس قسم کی بے اطمینانی کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہے گی۔ میں اس مکتوب کے ساتھ آرڈیننس کے متعلق چند اجمالی معروضات منسلک کر رہا ہوں اور اس دعا پر اسے ختم کر رہا ہوں۔

صدرِ مملکتِ پاکستان کا جواب

مری۔ یکم جون ۱۹۶۱ء۔

محترمی و مکرمی۔ اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ۔

ازدواجی اور عائلی قوانین کے متعلق، آپ کا گرامی نامہ مجھے مل گیا تھا میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا۔ مجھے مسرت ہوئی کہ اس مسئلہ پر اظہارِ رائے کے لئے آپ نے افہام و تفہیم کا طریق اختیار فرمایا، ورنہ عام دستور تو یہ ہو گیا ہے کہ اختلافِ رائے کے اظہار کے لئے اکثر علمائے کرام دوسری روش پسند کرتے ہیں۔ آپ نے جس متانت، سنجیدگی اور تفصیل سے اپنے خیالات تحریر فرمائے ہیں۔ اس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ آپ کے خط کے ساتھ منسلکہ نوٹ میں جو جزوی تفصیلات ہیں، ان پر غور ہو رہا ہے اور ان کے متعلق متعلقہ وزارت آپ کو الگ لکھے گی۔ یہاں پر میں فقط چند ذاتی گزارشات کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کے ارشادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرہ میں بد رسوم کا عموماً اور ازدواجی رسوم کی اصلاح کا خصوصاً آپ کو بھی شدید احساس ہے۔ درحقیقت ہمارا معاشرہ جن بدعتوں کا شکار ہوا ہے۔ ان کی اصلاح سے کوئی ایمان دار اور روشن خیال انسان انکار نہیں کر سکتا۔

تعددِ ازدواج کی تباہ کاریاں

عوام کے ساتھ آپ کا جو گہرا رابطہ ہے، اس سے آپ پر اس حقیقت کا انکشاف ضرور ہوا ہوگا کہ ہمارے ملک میں تعددِ ازدواج کے پردے میں جو مظالم ہوئے ہیں، ان سے نہ صرف ہزاروں بے زبان مستورات اور معصوم بچے تباہ ہو جاتے ہیں بلکہ بیشمار خاندان بھی، معاشی، اخلاقی اور سماجی طور پر برباد ہو جاتے ہیں۔ اہلِ ہنود میں ستی کی بدعت کو ہر ذی عقل اور باشعور انسان قابلِ نفرت سمجھتا رہا ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہماری ازدواجی رسوم بدعورتوں اور بچوں کے لئے ستی سے بھی زیادہ

ہولناک ہیں۔ ستی میں تو صرف ایک بے گناہ عورت آگ میں جل کر جان دے دیتی ہے، لیکن ہمارے ملک میں بے شمار عورتیں ساری عمر ظلم و تشدد کی آگ میں بے بسی سے جلتی رہتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک عظیم ظلم اور وحشی پن ہے۔

ذمہ داریاں بحیثیت صدر

اس ملک کا صدر ہونے کی حیثیت سے، میں ایسے مظالم سے چشم پوشی اختیار نہیں کر سکتا۔ جہاں تک میں کلام پاک کو سمجھ سکا ہوں، اس کی رو سے ظالم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو اختیار ملے اور وہ اُسے غلط اور ناجائز طور پر استعمال کریں۔ لیکن سب سے بڑا ظالم وہ ہوتا ہے جس کو معاشرہ کی طرف سے اختیار حاصل ہو اور وہ مظالم کے دور کرنے میں کوتاہی اور کم ہمتی سے کام لے۔

عائلی کمیشن اور اس کی سفارشات

ازدواجی رسوم سے پیدا ہونے والے مظالم کے قلع قمع کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود کے اندر ایسے ضابطے بنائے جائیں جو تعددِ ازدواج کی بے راہ رویوں پر قابو پا سکیں۔ اس اصلاح کا فرض خود معاشرہ کے ذمہ تھا۔ لیکن صدیوں کے جمود کی وجہ سے ہمارا معاشرہ فی الحال اتنا بیدار نہیں ہوا کہ اپنی اصلاح پر آپ آمادہ ہو جائے۔ بوجوہ، ایسے کام حکومت کے سر ہی پڑتے ہیں۔ پچھلی حکومتوں نے عائلی اور ازدواجی قوانین کی اصلاح کے لئے ایک کمیشن قائم کیا تھا جس کے ممبر صاحبِ علم بھی تھے، قانون داں بھی تھے اور مسلمان بھی تھے۔ ایک اختلافی نوٹ کے علاوہ اس کمیشن نے چند متفقہ تجاویز و سفارشات پیش کی تھیں۔ بعض سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے، سابقہ حکومتیں ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت نہ کر سکیں۔

بنیادی اصلاحات کا نفاذ

جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے، میں وقتی مصلحتوں کو بنیادی اصلاحات پر مقدم نہیں سمجھتا نہ ہی میں سستی شہرت اور ہر دل عزیزی کی خاطر ضروری اصلاحات کے نفاذ کو معرضِ التوا میں ڈالنا شرافت اور ایمان داری کی دلیل سمجھتا ہوں۔ چنانچہ آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ پچھلے اڑھائی سال میں جتنی اصلاحات نافذ ہوئی ہیں وہ عارضی ہر دل عزیزی حاصل کرنے کے ان طریقوں سے بہت مختلف ہیں جو عام طور پر اربابِ حکومت اختیار کرنے کے عادی ہیں۔ ہر اصلاح سے کسی نہ کسی طاقت، عنصر یا طبقہ پر ضرور ضرب پڑتی ہے۔ لیکن صرف اس وجہ سے اچھے اقدام کو پس پشت ڈالنا میرے ضمیر کے منافی ہے۔ مجھے دین سے محبت ضرور ہے لیکن دین کے علم کا زیادہ دعویٰ نہیں۔ عائلی اور ازدواجی قوانین کے سلسلہ میں میں نے صرف ان تجاویز اور تجاویز پر عمل کیا ہے، جو کمیشن نے ترتیب دی تھی اور جنھیں ہماری وزارتِ قانون نے پوری طرح جائزہ لینے کے بعد موجودہ شکل دی ہے۔

ازدواجی قوانین اسلامی احکام کے منافی نہیں

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، اس قانون کا قرآن شریف کے احکام یا حدیث کی تشریح

کے ساتھ کسی قسم کا تصادم نہیں ہوتا، یہ قانون اصولوں سے نہیں بلکہ مسلمہ اصولوں پر عمل کے طریقِ کار سے تعلق رکھتا ہے۔

اصولوں سے انحراف تو قطعی ناممکن ہے۔ لیکن ان پر عمل کے طریقِ کار کو تقاضائے وقت کے ساتھ ساتھ وضع کرنا صرف حکومت کا ہی نہیں بلکہ خود علمائے کرام کا بھی فرض ہے۔ اس بات کو میں "فرض" اس لئے کہتا ہوں کہ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم حال اور مستقبل کے دور میں زندگی کو لادینی کے غار سے بچا سکتے ہیں۔

نئے طریقِ کار

ایک سیدھے سادھے مسلمان کی حیثیت سے میرا خیال ہے کہ سُنّت، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ہمیں عمل کے لیے ایسے طریقہائے کار وضع کرنے پڑیں گے جو آجکل کی دنیا میں قابلِ عمل اور موجودہ انسان کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ اگر ہم نے اس میں کوتاہی کی تو ہم خود زندگی اور مذہب کے درمیان ایک گہری خلیج حائل کرنے کے مجرم ہوں گے۔ یہ قاعدہ ہے کہ جب کبھی مروجہ روش سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ بات ان طبقوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو اس کے عادی ہو چکے تھے۔ یا جن کے لئے وہ روش کسی قسم کے ذاتی یا جماعتی منفعت یا وقار کی باعث تھی۔ لیکن سچے "جذبۂ خدمت" کا یہی تقاضا ہے کہ ایسی ذہنی یا نفسیاتی رکاوٹوں کو ترقی کی راہ کا روڑا نہ بننے دیا جائے۔

مذہب کو غلط روایات اور تعصّبات سے پاک کرنے کی اپیل

میں اس خط کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، تفصیلی جواب آپ کو متعلقہ وزارت سے الگ مل جائے گا۔ یہاں پر میری صرف اتنی گزارش ہے کہ وہ لوگ، جن کو اللہ تعالیٰ نے دینی فہم و بصیرت عطا کی ہے ان پر ایک بڑا بھاری فرض عائد ہوتا ہے۔ وہ فرض یہ ہے کہ مذہب کو غلط روایات اور تعصبات سے آزاد کر کے اس سائنسی دور میں ہر بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ ہم قدم رکھا جائے۔ میرا ایمان ہے کہ اسلام ہی ایسا مذہب ہے جس میں ہر زمانے اور ہر ماحول کا ساتھ دینے اور ان پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر آج زندگی اور مذہب ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں تو اس میں کوتاہی ہماری اپنی ہے۔ مذہب یا زندگی کا قصور نہیں۔ آپ صاحبِ علم، روشن خیال اور دردمند بزرگ ہیں۔ میری استدعا ہے کہ آپ ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں۔

میزان پبلیکیشنز کی تازہ پیشکش

دھتکارے ہوئے انسان

جیل کی سلاخوں کے پیچھے کی دنیا کے پُراسرار حالات۔ قاتلوں، ڈاکوؤں، گرہ کٹوں اور سنگین مجرموں کے جرائم کا پس منظر

عنایت اللہ نے یہ کتاب لکھ کر معاشرہ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ قیمت پانچ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ——— ۲۷-بی - شاہ عالم مارکیٹ لاہور

معارف الحدیث

سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ لوگوں نے نماز کا وقت معلوم کرانے کے سلسلہ میں آگ اور ناقوس کا ذکر کیا۔ پس ذکر کیا یہود اور نصاریٰ کا (کہ یہ لوگ ایسا ہی کرتے تھے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلالؓ کو حکم دیا کہ اذان کے کلموں کو دو دو بار کہیں اور ایک بار تکبیر۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث کی تشریح سے پہلے مختصراً اذان کے بارے میں کچھ عرض کروں گا۔ قرآنِ حکیم میں صرف دو مقامات پر اذان کا ذکر ملتا ہے۔ ایک اس آیت میں کہ "جب تم نماز کے لئے پکارتے ہو تو یہود اور مشرکین اس کا مذاق اڑاتے ہیں"۔ دوسرا اس آیت میں کہ "اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ ــــ" "جب جمعہ کے روز نماز کے لئے پکارا جائے"۔ ان دونوں آیتوں کے الفاظ خود اس بات پر شاہد ہیں کہ اذان کا طریقہ اس سے پہلے شروع ہو چکا تھا۔ اور یہاں ایک چلتے ہوئے طریقے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ اے لوگو! نماز کے لئے پکارو۔ پہلی آیت میں یہ بتایا ہے کہ جب تم اذان دیتے ہو تو مشرکین اور یہود تمہارا مذاق اڑاتے ہیں۔ دوسری آیت میں یہ فرمایا ہے کہ جب تمہیں جمعہ کے دن نماز کے لئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت ترک کر دو۔ اس کی شانِ نزول یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔ اتنے میں ڈھول بجا جو اس بات کی علامت تھی کہ تجارت کا کوئی قافلہ آیا ہے، تو نمازی خطبہ چھوڑ کر جانے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی بہرحال اس میں بھی نماز کے لئے پکارنے کا حکم نہیں فرمایا گیا ہے کہ جب تم پکارے جاؤ تو خرید و فروخت ترک کر دو۔

پھر قرآنِ حکیم میں اذان کا ذکر تو ہے مگر اذان کے الفاظ موجود نہیں۔ اب یہ طریقہ رائج کیسے ہوا۔ اس باب الاذان میں اس کا بیان ہو رہا ہے۔ آپ ایک طرف رواجِ عام کو دیکھئے اور دوسری طرف ان روایات پر نظر ڈالئے۔ آپ کو ان میں کامل ہم آہنگی اور مطابقت نظر آئے گی۔ لاکھوں، کروڑوں آدمی اذان دیتے ہیں۔ ان سے پوچھئے تو وہ بتائیں گے کہ ہمیں بچپن سے یہی اذان ورثہ میں ملی ہے گویا نسلاً بعد نسلٍ اذان کا یہ طریقہ ہم تک منتقل ہو کر پہنچا ہے۔

مندرجۂ بالا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب حضورؐ مدینہ تشریف لائے ہیں اور یہاں آکر نماز باجماعت کا اہتمام کیا گیا (مکہ میں تو اس کا کوئی موقعہ نہیں تھا۔ وہاں تو چھپ چھپا کر مسلمان فریضۂ نماز ادا کرتے تھے) تو یہ مسئلہ پیش ہوا کہ نماز کے لئے لوگوں کو کیسے جمع کیا جائے۔ اگر کسی معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آجاتا تھا تو پھر مشورہ کا سوال

① پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جب ایسا نہ ہوتا تو حضورؐ صحابہؓ سے مشورہ کرتے۔ جب اس مسئلہ میں مشورہ لیا گیا تو کسی نے آگ جلانے کا مشورہ دیا کہ نماز کی روشنی دیکھ کر نماز کے لئے جمع ہو جائیں اور کسی نے ناقوس بجانے کا۔ پھر کسی کو خیال آیا کہ یہ دونوں طریقے تو یہود و نصاریٰ کے ہاں رائج ہیں۔ ہم نے بھی اگر انہیں اختیار کر لیا تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جائے گا کہ یہ بلاوا کس طرف سے ہے۔ دوسرے اس سے تشبہ بھی ہوتا ہے۔ آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا کہ وہ اذان کہیں۔ اور اذان میں ہر ہر کلمہ دو دو مرتبہ اور اقامت میں ایک ایک مرتبہ۔ (یہ ایک مختصر حدیث ہے جس کی تشریح آگے آتی ہے)۔ حضرت اسمٰعیل اس پر اتنا اضافہ کرتے ہیں کہ میں نے جب حضرت ایوب سے اس بات کا ذکر کیا (کہ اذان میں ہر کلمہ دو دو مرتبہ دہرایا جائے اور اقامت میں ایک ایک مرتبہ) تو انھوں نے اقامت کو اس سے مستثنیٰ کیا یعنی انھوں نے کہا کہ قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ بھی دو مرتبہ کہا جائے۔

اس سلسلہ میں مختلف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے کسی مؤذن کو یہ طریقہ سکھایا کہ وہ ہر کلمہ کو اذان میں دو دو مرتبہ کہے اور تکبیر اقامہ میں ایک ایک بار اور کسی کو دونوں میں دو دو بار کہنے کی ہدایت فرمائی۔ انہی روایات کی بنا پر فقہاء کے درمیان اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔ لیکن یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ دوسرا طریقہ غلط ہے۔ منکرین حدیث اس طرح کے چھوٹے موٹے اختلافات سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ سب گھڑی ہوئی باتیں ہیں حالانکہ اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ ایک کلمہ کو ایک مرتبہ کہا جائے یا دو مرتبہ۔ اصل مسئلہ اذان کا طریقہ معین ہونے کا ہے۔ تکبیر کا ہے۔ الفاظ کا ہے۔ اور یہ باتیں تمام روایات سے ثابت ہیں۔ اب آگے روایات آتی ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ

مختلف طریقے آپؐ نے خود سکھائے، اور مختلف مؤذن، مختلف طریقوں سے اذان دیتے تھے۔ اس لئے یہ سب

② طریقے صحیح تھے۔ آپؐ نے مختلف طریقے اس لئے سکھائے تاکہ مسلمانوں میں توسع پیدا ہو اور کوئی یہ نہ کہے کہ بس فلاں طریقہ ہی صحیح ہے۔ باقی سب طریقے غلط ہیں۔

حضرت ابی محذورہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس مجھے اذان سکھائی۔ فرمایا کہو۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (اللہ بہت بڑا ہے) اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ (میں شہادت دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں) اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا

رَسُوْلُ اللّٰہ (میں گواہی دیتا ہوں کہ محمدؐ خدا کے رسول ہیں) پھر فرمایا وہی جملے دوبارہ کہو جو پہلے کہے تھے۔ یعنی اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ، اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ۔ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہ۔ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ (آؤ نماز کی طرف) حَیَّ عَلَی الْفَلَاحْ ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحْ (آؤ فلاح کی طرف) اَللّٰہُ اَکْبَرُ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ۔ (مسلم)

حضرت ابی محذورہؓ حضورؐ کے عہد میں مکہ کے مؤذن تھے۔ اور ان کا شمار عہدِ رسالت کے ان پانچ بڑے مؤذنوں میں ہوتا ہے، جن سے اذان کی روایات مروی ہیں۔ ان کو آپؐ نے یہ بتایا کہ پہلے یہ چار کلمے آہستہ سے کہو۔ پھر ان کا اعادہ زور سے کرو۔ یہ طریقہ صرف انہی مؤذن کو بتایا گیا۔ میں نے غور کیا کہ اس کی وجہ کیا ہے کہ مدینہ والوں کو آپؐ نے ایک ہی مرتبہ کہنے کا حکم دیا، مگر مکہ والوں کو دو دو مرتبہ۔ تو میری سمجھ میں یہ آیا کہ ابی محذورہ مکہ کے مؤذن تھے۔ اور یہ وہ جگہ تھی جہاں مسلمان تیرہ سال چھُپ چھُپا کر نماز ادا کرتے رہے۔ لڑائی جو کچھ تھی وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر تھی۔ اسلام کا آغاز یہاں سے ہوا تھا کہ مسلمان پہلے یہ کلمات آہستہ کہتے تھے۔ لیکن اب اللہ نے انھیں اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ وہ پورے زور سے یہ شہادت دے سکیں۔

حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز اور اذان کے دو دو کلمے تھے اور تکبیر کا ایک۔ لیکن تکبیر میں (قد قامت الصلوٰۃ، قد قامت الصلوٰۃ) (نماز کھڑی ہوگئی، نماز کھڑی ہوگئی) دو دو مرتبہ کہے جاتے تھے۔ (ابو داؤد ۔ نسائی ۔ دارمی)

حضرت ابی محذورہؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اذان کے اُنیس ۱۹ کلمے سکھائے اور تکبیر کے سترہ کلمے۔ (احمد ۔ ترمذی ۔ نسائی ۔ ابو داؤد ۔ دارمی ۔ ابن ماجہ)

اس حکم کی مصلحت کیا ہے؟ اللہ اور اللہ کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی لئے فقہاء میں سے کوئی یہ نہیں کہتا کہ ان میں کسی طریقہ پر عمل کرنے والا غلط کر رہا ہے۔ اب بھی اہلِ حدیث حضرات ہر کلمہ ایک ایک مرتبہ کہتے ہیں اور حنفی دو دو مرتبہ اور دونوں طریقے سُنّتِ رسول سے ثابت ہیں۔

حضرت ابی محذورہؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسولؐ اللہ سے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ مجھے اذان کا طریقہ سکھا دو۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سن کر رسولؐ اللہ نے ابی محذورہ کی پیشانی پہ ہاتھ پھیرا اور پھر فرمایا کہو۔ اللہ اکبر

اللہ اکبر۔ بلند آواز سے۔ پھر کہو اشہد ان لا الٰہ الا اللہ، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ۔ اشہد ان محمدًا رسول اللہ، اشہد ان محمدًا رسول اللہ۔ حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصلوٰۃ۔ حیّ علی الفلاح، حیّ علی الفلاح۔ اگر صبح کی نماز ہو تو یہ الفاظ بھی کہے۔ الصلوٰۃ خیرٌ من النوم، الصلوٰۃ خیرٌ من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) اللہ اکبر اللہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللہ۔ (ابوداؤد)

یہ ان کی دوسری روایت ہے جس میں پہلی روایت کی مزید وضاحت ہو گئی ہے۔

(ماخوذ از "شہاب" ۵/۶۱ ۱۴)

طلوعِ اسلام محترم مودودی صاحب کے بیان کی شق (۱) سے واضح ہے کہ جن معاملات میں خدا کی طرف سے حکم نہیں آتا تھا، ان میں حضورؐ، صحابہؓ کے مشورہ سے بات طے فرما لیتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ جو معاملات اس طرح (خدا کے حکم سے نہیں بلکہ باہمی مشورہ سے) طے پائے ہوں۔ اور بعد کے حالات ان میں کسی تبدیلی کے متقاضی ہوں، تو کیا حضورؐ کا کوئی سچا جانشین (جو اُمت کو احکامِ خداوندی کے مطابق چلائے) اپنے رفقاء کے مشورہ سے ایسی تبدیلی کر سکتا ہے، یا نہیں؟ اس باب میں خطیب بغدادی نے، اپنی تاریخ میں امام ابوحنیفہؒ کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

"وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپؐ تعینِ جزئیات (تدوینِ فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی تھی اُسے اختیار فرما لیا کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر میں بھی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تو میں بھی اس مجلسِ مشاورت میں شریک ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضورؐ میری رائے کو اختیار فرما لیتے"۔ چنانچہ "محمود بن موسےٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سُنا کہ امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہؐ مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپؐ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحٰق کو میں نے کہتے سنا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے سامنے اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان سے اختلاف کیا کرتے"۔

یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفراء نے بھی اسی قول کو نقل کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔ "ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبیؐ مجھے پاتے اور میں آپؐ کو پاتا تو آپ میرے بہت سے اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے"۔

(تاریخ خطیب جلد ۱۳ صفحہ ۳۶۹ - ۳۸۷)

طلوعِ اسلام کا مسلک بھی یہی ہے کہ جن معاملات میں خدا کا حکم موجود نہ ہو، ان میں "(عند الضرورت) خلافت علیٰ منہاجِ رسالت" باہمی مشاورت سے، سابقہ فیصلوں میں تبدیلی کر سکتی ہے، بشرطیکہ یہ تبدیلی قرآنِ کریم کی حدود سے نہ ٹکرائے۔

(۲)۔ مودودی صاحب کی شق (۴) سے ظاہر ہے کہ دین کے معاملات میں حضورؐ، مختلف لوگوں کو مختلف طریقے بتایا کرتے تھے۔ اور اس میں حکمت یہ تھی کہ "مسلمانوں میں توسع پیدا ہو۔" (اس سے تو کون متفق ہو سکتا ہے کہ جن امور میں امت میں ہم آہنگی مطلوب ہو، ان میں بھی حضورؐ، مختلف لوگوں کو مختلف طریقے بتایا کرتے تھے۔ بایں ہمہ، سوال یہ ہے کہ) اگر کوئی صحیح اسلامی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) اس قسم کے معاملات میں جن میں خدا کا حکم موجود نہ ہو، مسلمانوں میں توسع پیدا کرنے کے لئے کوئی ایسا طریق تجویز کرے جو مروجہ طریقوں سے مختلف ہو، تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ہو گی یا نہیں؟

(۳)۔ اذان کس طرح تجویز ہوئی تھی، اس کے متعلق مودودی صاحب نے وہ مشہور حدیث بیان نہیں کی جو مشکوٰۃ شریف (اذان کے بیان) میں منقول ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

> عبداللہؓ بن زید بن عبد ربہ نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقوس بجانے کا حکم دیا تاکہ اس کو بجا کر لوگوں کو نماز کے لئے جمع کریں تو مجھ کو خواب میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں ناقوس تھا۔ پس میں نے خواب ہی میں اُس سے پوچھا، اے اللہ کے بندے کیا فروخت کرتا ہے تو ناقوس کو؟ اس نے کہا تو ناقوس کا کیا کرے گا؟ میں نے کہا کہ ہم اس سے نماز کے لئے بلائیں گے۔ اس نے کہا کیا میں تجھ کو ایسی چیز نہ بتلا دوں جو اس سے بہتر ہے۔ میں نے کہا ہاں، پس اس نے کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر الخ اور اسی طرح تکبیر۔ پس جب صبح ہوئی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور اپنا خواب بیان کیا۔ پس فرمایا آپ نے تحقیق یہ خواب حق ہے جو خدا چاہے۔ پس کھڑا ہو تو بلالؓ کے ساتھ اور جو خواب میں دیکھا ہے اس کو بتلا اور وہ اذان کہے، اس لئے کہ وہ بلند آواز ہے تجھ سے۔ پس کھڑا ہوا میں بلالؓ کے ساتھ اور اس کو اذان کے کلمے بتانے لگا، اور وہ اذان کہتے رہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جب عمرؓ ابن الخطاب نے اپنے گھر میں اذان کی آواز سُنی تو چادر گھسیٹتے ہوئے گھر سے نکلے اور رسول اللہؐ سے عرض کیا۔ یا رسولؐ اللہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دیکر بھیجا ہے میں نے بھی ایسا ہی خواب دیکھا ہے، جیسا کہ دکھایا عبداللہؓ کو۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ پس خدا ہی کے لئے تعریف ہے۔　　　(ترجمہ مشکوٰۃ۔ جلد اوّل۔ صہ ۱۴۸)

جس طرح

تاج محل

آج بھی اُسی طرح تروتازہ اور شگفتہ وشاداب ہے جس طرح آج سے تین سو سال پہلے۔ اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں، اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی قدروقیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصنیف

انسان نے کیا سوچا؟

اور

سلیم کے نام خطوط

ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقے کے قلب ونگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

انسان نے کیا سوچا؟ انسانی فکر کی دو ہزار سال کی تاریخ ہے جسے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے، اور جس سے انسان غیر شعوری طور پر عقل اور وحی کے صحیح مقامات سے شناسا ہو جاتا ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں بھی اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔

سلیم کے نام خطوط اپنی طرز کی واحد کتاب ہے۔ انسان کی عملی زندگی کے متعلق کونسا سوال ہے جس پر اس میں بحث نہیں کی گئی۔ دونوں کتابیں حسین ٹائپ میں چھپی ہیں۔

انسان نے کیا سوچا؟ - بڑی تقطیع - ضخامت :- پونے پانچ سو صفحات۔ قیمت :- بارہ روپے

سلیم کے نام خطوط - (تین خوبصورت جلدوں میں)۔ قیمت جلد اول :- آٹھ روپے

جلد دوم :- چھ روپے۔ جلد سوم :- چھ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

حقائق و عبر

محبّت کے سات سو مقامات

خواجہ فرید الدّین گنجِ شکرؒ کے عرس کی تقریب پر، نوائے وقت، (مورخہ ۱۵ ۶/۶۱) کی اشاعتِ خاص میں آپؒ کے کچھ کوائفِ حیات شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض حصّوں سے آپ بھی مستفید ہوں۔ لکھا ہے :۔

وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں ریاضت کر رہا تھا۔ نفس کی لذّات سے محروم رہ کر حقیقتِ حق کی تلاش میں بے شمار صعوبتیں برداشت کر رہا تھا۔ ایک روز اُسے پیاس لگی تو وہ چل کر کنوئیں تک آیا۔ وہاں نہ ڈول تھا نہ ڈوری۔ پانی تہ میں تارہ بنا تھا۔ مایوس ہوا۔ واپس جا رہا تھا کہ دو ہرن آتے نظر پڑے۔ ہرن کنوئیں کے کنارے پر پہنچے تو پانی اُچھل کر کناروں تک پہنچ گیا۔ وہ شخص دیکھتا رہا۔ ہرنوں نے پانی پیا اور چل دیئے۔ وہ شخص بھی پیاس بُجھانے کے لئے بڑھا۔ مگر پانی پھر نیچے اُتر گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر کہا :

"الٰہی تو نے ہرنوں کو تو پانی پلا دیا مگر اپنے بندے کو کیوں محروم کر دیا!"

آواز آئی :۔ "تو نے ڈول اور ڈوری پر توکّل کیا، جانوروں نے مجھ پر ..... وہ سیراب ہوئے اور تو محروم"۔

اور یہ سنتے ہی وہ جنگلوں اور پہاڑوں میں چلا گیا۔ چالیس دن عبادت میں گزارے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی حلق میں نہ ڈالا۔ اور چالیس دن بعد اس نے ایک مُٹھی خاک منہ میں ڈالی۔ خاک فوراً شکر ہو گئی اور غیب سے آواز آئی :۔

"فریدؔ! تو برگزیدہ بندوں میں سے ہوا کہ تیری عبادت قبول ہوئی۔ اب سے تو گنجِ شکر ہے"۔

اور یہ گنجِ شکر، شیخ فرید الدّینؒ ہی تھے، جن کا مزارِ مقدس پاک پٹن میں ہے۔ اور جو برِّ صغیر کے

لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے لئے منبعِ فیض بنا ہوا ہے۔

۔۔۔۔۔آپ کے گنج شکر ہونے کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی جاتی ہیں۔ سیرالعارفین میں لکھا ہے۔

"جس زمانے میں حضرت فریدالدینؒ اپنے مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کی خدمت میں تربیت پا رہے تھے تو ایک بار انھوں نے سات دن تک متواتر روزہ رکھا۔ افطار کے وقت اپنے حجرے سے خواجہ صاحب کے پاس جا رہے تھے کہ ایک جگہ کیچڑ میں پاؤں پھسل گیا، زمین پر گر پڑے، کیچڑ منھ میں چلی گئی، مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی قدرت سے وہ شکر بن گئی۔ جب مرشد کی خدمت میں پہنچ کر یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اگر مٹی تمھارے منھ میں جاکر شکر بن گئی تو خداوندِ تعالیٰ تمھارے سارے وجود کو شکر بنا دے گا اور تم ہمیشہ شیریں رہو گے۔ اس کے بعد گنج شکر مشہور ہو گئے۔"

خزینۃ الاصفیاء کے مؤلف نے ایک حوالہ سے لکھا ہے۔ ایک سوداگر اونٹوں پر شکر لاد کر ملتان سے دھلی کی طرف جا رہا تھا۔ جب وہ اجودھن پہنچا تو شیخ فریدالدینؒ نے اس سے پوچھا کہ اونٹوں پر کیا ہے؟ سوداگر نے تمسخر سے جواب دیا کہ نمک ہے۔ شیخ فریدالدینؒ نے سن کر کہا۔ "بہتر ہے، نمک ہی ہوگا۔" سوداگر جب منزلِ مقصود پر پہنچا تو اونٹوں پر شکر کی بجائے نمک پاکر سخت گھبرایا، اسی وقت واپس ہوا اور شیخ فریدؒ کی خدمت میں پہنچ کر اپنی تقصیر کی معافی چاہی۔ شیخ نے فرمایا، اگر شکر تھی تو شکر ہو جائے گی۔ چنانچہ نمک شکر میں تبدیل ہوگیا۔ بیرم خاں، خان خاناں نے اس واقعہ کو منظوم کیا۔ ایک شعر ہے۔ ؎

کانِ نمک، جہانِ شکر، شیخ بحر و بر
آں کز شکر نمک کند و از نمک شکر

۔۔۔۔۔حضرت گنج شکرؒ نے راہِ سلوک کے طے کرنے میں بڑی محنتِ شاقہ کی۔ خود فرماتے ہیں کہ آپ بیس۲۰ برس تک عالمِ تفکر میں کھڑے رہے۔ آپ کے پاؤں سُوج گئے تھے اور اُن سے خون بہتا تھا۔ اس درمیان میں آپ کو یاد نہیں کہ آپ نے کچھ کھایا ہو۔

حضرت گنج شکرؒ کے نکاح میں الغ خاں کی لڑکی بی بی زہرہ بھی تھیں جن سے چھ لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں الغ خاں جب بادشاہ بن کر دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا تو اس سے گنج شکرؒ کی شانِ استغنار و بے نیازی بدستور قائم رہی۔ ایک بار کسی نے ان سے غیاث الدین بلبن کے پاس کچھ سفارش چاہی تو آپؒ نے سفارش نامہ اس طرح لکھا:۔

"میں اس شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بعد آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ اگر آپ اس کو کچھ دیدیں گے تو حقیقی عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہوگا اور آپ مشکور رہوں گے۔ اور اگر آپ نہیں دیں گے تو

مانع اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اور آپ معذور ہوں گے۔"

حضرت گنجِ شکر کی تصنیفات میں آپ کے دو ملفوظات ہیں۔ "راحت القلوب" اور "سیر الاولیاء" راحت القلوب کو خواجہ نظام الدین اولیاء، اور سیر الاولیاء کو حضرت بدر اسحاق نے مرتب کیا۔ دونوں گنجِ شکر کے خلیفہ تھے۔

سیر الاولیاء کے شروع میں شیخ فرید الدین گنجِ شکر نے عشقِ الٰہی پر گفتگو کی ہے۔ فرماتے ہیں "فقراء کا عشق علماء اور اصحابِ عقل کے عشق سے بالکل جدا ہے۔ اس عشق کی راہ میں، محبت کے سات سو مقامات ہیں اس عشق کا عنصر صرف آگ ہوتی ہے۔ جس کے شعلہ سے تمام عالم جلکر خاک سیاہ ہو سکتا ہے۔ اس عشق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ عشق اپنی دوئی کھو کر اپنے آپ سے بالکل ایک ہو جاتا ہے۔ عشق میں عاشق اپنے معشوق کی طلب میں مجاہدہ کرتا ہے۔ جس سے اس کو مکاشفہ ہوتا ہے۔ مکاشفہ کے بعد مشاہدہ یعنی دیدار۔ اس مشاہدہ سے اس کا عشق اور بھی تیز ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ حجابات اُٹھتے جاتے ہیں۔ اور عاشق ایک ایسے مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ صرف عالمِ تحیر میں رہتا ہے۔"

حضرت گنجِ شکرؒ نے سماع کو راحتِ دل قرار دیا ہے۔ "یہ اہلِ محبت کے دل میں حرکت پیدا کرتا ہے حرکت کے بعد حیرت، حیرت کے بعد ذوق اور ذوق کے بعد بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس بیہوشی میں ایسا استغراق ہو جاتا ہے کہ اگر اس وقت اس کے سر پر ہزاروں تلواریں چلیں تو بھی اس کو خبر نہ ہو۔ اور یہی چار چیزیں معرفت کا سبب بنتی ہیں۔"

"صوفی کی زندگی ذکرِ حق میں مشغول ہونا ہے، اور جب تک ذکرِ حق میں مستغرق ہو کر بے ہوش رہتا ہے تو وہ زندہ ہے۔ اور جب ہوش میں آکر ذکرِ حق چھوڑ دیتا ہے تو مُردہ ہو جاتا ہے۔" گنجِ شکرؒ نے خواجگانِ چشت کے مسلک کے مطابق صوفی کو کشف کے اظہار سے منع کیا ہے۔

نوٹ | آپؒ کے ملفوظات (راحت القلوب) کے اقتباسات "سلیم کے نام خطوط - جلد سوم" میں ملیں گے وہیں سے دو ایک درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ ایک مجلس میں فرمایا:-

"خواجہ ابو سعید ابو الخیرؒ ایک دفعہ ذکرِ خدا میں مشغول تھے کہ بال کی جڑ سے خون روانہ ہونے لگا۔ اہلِ خانہ نے ایک کاسہ چوبیں نشست کے نیچے رکھ دیا کہ جو خون بہے وہ کاسہ میں جمع ہو جائے۔ آپ کے جسم مبارک سے اس قدر خون رواں تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ کاسہ بھر گیا۔ اور اہلِ خانہ نے وہ خون پی لیا۔"

ایک مجلس میں فرمایا کہ:-

"نواحِ غزنی میں میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ نہایت ضعیف اور لاغر تھے۔ ان کی عادت تھی کہ ہر شب

ایک سو بیس رکعات نمازِ نفل ادا فرماتے تھے۔ لیکن عارضۂ شکم کی وجہ سے ہر دو رکعت کے بعد انہیں قضائے حاجت کی ضرورت ہوتی تھی۔ آپ قضائے حاجت کے واسطے تشریف لے جاتے، واپس آکر غسل فرماتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ پھر قضائے حاجت ہوتی اور غسل کرتے اور دوگانہ ادا کرتے۔ مختصراً یہ کہ اس شب وہ ساٹھ مرتبہ نہائے اور اپنا وظیفہ ادا کیا۔ آخر بار جب نہانے تشریف لے گئے تو میانِ آب انتقال فرمایا۔ سبحان اللہ! کیا مضبوط اور راسخ العقیدہ تھے۔"

ایک مجلس میں فرمایا:۔

"ایک نوجوان واصلانِ حق میں سے تھا۔ جب عمر اس کی تمام ہوئی ملک الموت نے اس کو شرق سے غرب تک ڈھونڈا، لیکن نہیں پتہ پایا۔ مجبوراً اپنے مقام پر آکر سجدہ میں سر رکھا اور خدا سے درخواست کی کہ وہ اس نوجوان کا پتہ بتا دیں۔ حکم ہوا کہ اس نوجوان کو فلاں خرابہ میں تلاش کرو۔ لیکن ملک الموت کو اس کا وہاں بھی کچھ پتہ نہ چلا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے کہا اے ملک الموت! تم ہمارے دوستوں کی روح قبض نہیں کر سکتے اور نہ ان کو دیکھ سکتے ہو، وہ لوگ میرے پاس ہیں۔"

اس مجلس میں حضرت عمرؓ کے مناقب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ "ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک دہی بیچنے والا راستہ میں کھڑا رو رہا ہے۔ اُس نے کہا کہ میرا دہی زمین پر گر گیا تھا۔ زمین اُسے پی گئی ہے کیا آپ اسے دلوا سکتے ہیں۔ یہ سُن کر آپ نے درہ اٹھا کر نعرہ مارا کہ زمین! تو دہی واپس دیتی ہے یا نہیں۔ یہ سُنتے ہی زمین پھٹ گئی اور دہی اوپر نکل آیا۔ اس دہی والے نے اپنا سبوچہ دہی سے بھر لیا اور چلا دیا۔"

اسی طرح فرمایا کہ "ایک دفعہ حضرت عمرؓ اپنا خرقہ سی رہے تھے اور پُشت آپ کی جانبِ آفتاب تھی پشتِ مبارک آپ کی تمازتِ آفتاب سے گرم ہو گئی تو آپ نے نگاہِ غضب سے آفتاب کی طرف دیکھا، معاً فرشتوں کو حکم ہوا کہ نورِ آفتاب کا محو کریں کہ حضرت عمرؓ کے ساتھ گستاخی سے پیش آیا ہے۔ فرشتوں نے فی الفور تعمیل کی اور نورِ آفتاب سے لے لیا۔ جملہ جہان تاریک ہو گیا۔ رسول اللہ اس زمانہ میں حیات تھے ازحد غمناک ہوئے، فرمانے لگے کہ شاید قیامت قائم ہو گئی۔ جو نورِ آفتاب سے لے لیا گیا۔ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ حضرت جبرئیلؑ نازل ہوئے، اور بیان کیا کہ یا رسول اللہ! قیامت قائم نہیں ہوئی بلکہ آفتاب کا نور حضرت عمرؓ سے گستاخی کی وجہ سے چھین لیا گیا ہے۔ رسول اللہ نے حضرت عمرؓ کو طلب فرمایا اور شفاعت کی۔ حضرت عمرؓ نے سُورج کو معاف کر دیا۔ فی الفور جہان روشن ہو گیا۔"

ہمارے اولیائے کرامؒ کے ملفوظات اس قسم کے ہوتے ہیں!

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

جوں جوں مُلک میں قرآنی فکر عام ہو رہی ہے، طلوعِ اسلام کے خلاف پراپیگنڈہ بھی زیادہ تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے۔ حتّٰی کہ بعض حلقوں میں اس کی شدّت، اشتعال تک پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اُس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے؟ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں، وہ خدا کی طرف سے وحی ہے جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآنِ کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے، جس میں سہو بھی ہو سکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکر گزار ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآنِ کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جداگانہ ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ طلوعِ اسلام کہتا ہے، اُسے اُس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے پھر اُس پر قرآنِ کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں اور اُسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کر کے طلوعِ اسلام کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے، اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ اس نے کہا بھی ہے یا نہیں؛ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہم وقتاً فوقتاً طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک پیش کرتے رہتے ہیں تاکہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں، اُن پر حقیقت واضح ہو جائے۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اپنے مقصد و مسلک کو درج کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام کا عقیدہ اور مسلک یہ ہے کہ:-

۱۔ تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی، اسے اپنی راہنمائی کے لئے اُسی طرح وحی کی ضرورت ہے، جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

۲۔ خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں، قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے۔ جو تمام نوعِ انسانی کے لئے، ہمیشہ کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآنِ کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالت مآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

۳۔ قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے، وہ انسان کے سامنے ہو۔ اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے۔ اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

۴۔ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اُسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے، سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے، یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے، تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔

یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھنا چاہیئے۔

۵۔ دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو، دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر، اُن سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانینِ خداوندی کی یہ اطاعت، ایک نظام کی رُو سے ہو سکتی ہے۔ اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہو سکتا۔

۶۔ رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں، قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی، اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت، امت کے مشورہ سے، سر انجام پاتے تھے۔

۷۔ رسول اللہؐ کے بعد، دین کا یہی نظام، حضورؐ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت کے سر انجام پانے کا وہی طریقہ تھا، جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت، اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر، اُمت کے مشورہ سے، متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

۸۔ بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی

نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں، تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

۹۔ ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے۔ جو اُمت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکزِ ملت کہا جائے گا۔ اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت، خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کے چلانے والوں کی اپنی زندگی، سب سے پہلے، قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

۱۰۔ چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا، اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

۱۱۔ جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر اپنے اپنے طور پر چل رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرکے اُسے "خدا اور رسولؐ" کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق صرف قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اُمت کے اختلافات کو مٹا کر، اس میں وحدت پیدا کرے۔

۱۲۔ قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی ——— روٹی۔ کپڑا۔ مکان۔ علاج۔ تعلیم وغیرہ ——— بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

۱۳۔ قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے۔ اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو، یا روس کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظامہائے زندگی غیر خداوندی ہیں۔ لہٰذا باطل ہیں۔

——— یہ ہے ہمارا مسلک، جسے ہم برسوں سے دُہراتے چلے آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا پراپیگنڈہ ہے۔

——— یہ بھی یاد رہے کہ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں) نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے، اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے ہم

صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں، تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے

——— جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مقصد سے متفق ہوتے ہیں، وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام "بزمِ طلوعِ اسلام" ہے۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں، ان سے نہ کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے، نہ احکامِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے۔ نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں، نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو اپنا پیر سمجھتے ہیں نہ امیر۔ یہ صرف چند متفق الخیال احباب کا اجتماع ہوتا ہے، جو یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی اور پروگرام نہیں ہوتا اور یہ جو کچھ کرتے ہیں، کھلے بندوں کرتے ہیں۔ اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ۔

المختصر مسلمانوں کے قلب و دماغ سے، ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات، نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا ——— اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا ——— یہ ہے طلوعِ اسلام کا مقصود و مطلوب۔ اس میں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ وہ مغرب کی مادیت اور روس کی اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر، دینِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہوسکیں۔ وما توفیقی الّا باللہ العلیّ العظیم۔

معاشی مسئلہ آج نوعِ انسانی کی تاریخ کا عظیم ترین مسئلہ قرار پا چکا ہے۔

عصرِ حاضر کے مفکرین نے اسے حل کرنے کے لئے مختلف نظریات پیش کئے ہیں۔ یہ نظریات انسانی ذہن کے تازہ بتازہ تجربات کی پیداوار ہیں۔ اسکے مقابلہ پر پرویز صاحب کی

گرانمایہ تصنیف

نظامِ ربوبیّت

اس مسئلہ کا وہ نکھرا ہوا حل پیش کرتی ہے جو نوعِ انسانی کے لئے بارگاہ رب العالمین سے عطا فرمودہ آخری کتاب کا طرۂ امتیاز ہے۔

"نظامِ ربوبیت" اس موضوع پر اپنی نوعیت کی بے مثال تصنیف ہے۔ رعایتی قیمت ——— چار روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ - ۲۷-بی شاہ عالم مارکیٹ - لاہور